نیند سے پہلے

ٹوٹتے نشہ کی تلخی ہے ابھی تک باقی
دُکھ سے بھرپور ہیں یہ تُند چھلکتے ہوئے جام
جگمگاتے نہیں، ہنستے نہیں، اب رنگ محل
دب گیا نیند کی بانہوں میں کوئی حشر خرام

سیمگوں خواب بسر نے لگے افسانہ ہوئے
چاندنی بوئی تھیں جو کرنیں، وہ مرجھا بھی گئیں
سو گئیں خاک پہ شبنم کے طمانچے کھا کر
کلیاں جو کھلنے ہی والی تھیں وہ کمہلا بھی گئیں

گردشِ ارض میں گھل جاؤں گا کھو جاؤں گا
جم کے رہ جائے گا، امید کی پلکوں پہ لہو
جھک کے رہ جائے گی سنگِ درِ جاناں پہ جبیں
میرے بوسیدہ لبادے میں رہے گی نہ سکت
ماہ و سال اور لگا دیں نیا پیوند کہیں

اشک بہہ جائیں گے آثارِ سحر سے پہلے
خون ہو جائیں گے ارمان اثر سے پہلے
سرد پڑ جائے گی بجھتی ہوئی آنکھوں کی پکار
گرد برسوں کی چھپا دے گی مرا جسمِ نزار
جاگتے جاگتے تھک جاؤں گا سو جاؤں گا

نقشِ پا

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقشِ پا
کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں فضا میں جذب ہو گئیں
جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کون سا جہان ہے ازل نہیں، ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں؟

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
اُدھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اس طرف خبر نہیں
عدم خراب تر ملے، نہ موت ہو نہ زندگی

ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں
مگر یہ آہنی رسن، یہ حلقہ ہائے بستگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو گئے
میں نقشِ پائے عمر ہوں، فریب خوردۂ خوشی

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آ سکیں
یہ زرد زرد صورتیں، یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
ہوا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آ سکے
دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے!

مرحلے

تصوّرات کی شمعیں جلا کے دیکھ تو لوں
سیاہ خانۂ ہستی سجا کے دیکھ تو لوں
غمِ حیات پہ آنسو بہا کے دیکھ تو لوں
تری نظر سے ذرا دُور جا کے دیکھ تو لوں

پیئے ہوئے ہوں مئے غم سنبھل نہیں سکتا
ابھی تو ہوش میں دو گام چل نہیں سکتا
ابھی تو زیست کا عنواں بدل نہیں سکتا
محبتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ تو لوں

یہ گھر بنا کے گرا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
دیئے جلا کے بجھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
یہ ساری بزم اٹھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
خیال و خواب کی دنیا بسا کے دیکھ تو لوں

سیاہ و کہنہ محلکوں سے اس طرف کوئی
گھنی دبی ہوئی پلکوں سے اس طرف کوئی
پکارتا ہے دھندلکوں سے اس طرف کوئی
یہ دو قدم ہیں انہیں بھی اٹھا کے دیکھ تو لوں

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
افق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں
بس ایک بار ہی ڈگمگا کے دیکھ تو لوں

مآل

پھر خزاں آئی، اٹھا رختِ بہار
سخت مبہم ہے محبّت کا مآل
چوم لینے دے شہابی رخسار
کتنا تاریک ہے فردا کا خیال!

مجھ کو اس وقت یہ احساس نہیں
جھوٹ گو جھوٹ ہے رنگین تو ہے
تو کسی اور کی میراث نہیں
ایک ناکام سی تسکین تو ہے!

مٹ ہی جائیں گے یہ کمزور نقوش
جم کے بہ جاتی ہے قطبین پہ برف
زندگی ہائے نہ فردا ہے نہ دوش
عمر ہو جاتی ہے اک آہ میں صرف

ہل گئیں دُور نگاہوں کی حدود
تو مرے درد کا ساماں نہ سہی
ایک لمحے کو اُٹھا دے یہ قیود
میرے سینے میں یہ پیکاں نہ سہی

من چلے خواب ہیں سامانِ شکیب
زندگی درد ہو آزار نہیں
تلخ آنسو ہیں نگاہوں کا فریب
رُوح کچھ اتنی گرانبار نہیں

سخت مبہم ہے محبّت کا مآل
چوم لینے دے شہابی رخسار
کتنا تاریک ہے فردا کا خیال
پھر خزاں آئی اٹھا رختِ بہار!

دور کی آواز

نقرئی گھنٹیاں سی بجتی ہیں
دھیمی آواز میرے کانوں میں
دُور سے آ رہی ہے، تم شاید
بھُولے بسرے ہوئے زمانوں میں
اپنی میری شرارتیں شکوے
یاد کر کر کے ہنس رہی ہو کہیں!

لغزش

جھلملا کر بجھ گئے پاگل امیدوں کے دیے
تو سمجھتی ہے کہ میں ہوں آج تک اندوہگیں
وقت کے ہاتھوں نے آخر مندمل کر ہی دیا
اب مرے معصوم زخموں سے لہو بہتا نہیں

جب حنائی انگلیوں کی جنبشیں آتی ہیں یاد
جذب کر لیتا ہوں آنکھوں میں لہو کی بوند سی
اب مگر ماضی کی ہر شے پر اندھیرا چھا گیا
اور ہی راہوں سے گزری جا رہی ہے زندگی
ذہن میں ابھرے ہوئے ہیں چند بیجاں سے نقوش
اور ان میں بھی نہیں ہے کوئی ربطِ باہمی

خواب دیکھا تھا کسی دامن کی چھاؤں میں کبھی
ایک ایسا خواب جس کا مدعا کوئی نہیں
میں اکیلا جا رہا ہوں اور زمیں ہے سنگلاخ
اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں
راستے کٹتے ہوئے گم ہو گئے ہیں دھند میں
دُھند سے آگے خلا ہے راستہ کوئی نہیں

یہ بھیانک خواب کیوں مغلوب کرتے ہیں مجھے
دودھیا راتیں سحر کے جھٹپٹے میں کھو گئیں
اور تیری نرم باہیں مجھ سے اب ناآشنا
اور ہی گردن کے حلقے میں لپٹ کر سو گئیں
مسکرا اٹھتا ہوں اپنی سادگی پر میں کبھی
کس قدر تیزی سے یہ باتیں پرانی ہو گئیں

مَسجد

دُور، برگد کی گھنی چھاؤں میں، خاموش و ملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی و حال، گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی نّدی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کوئی
مرثیۂ عظمتِ رفتہ کا پڑھا کرتا ہے

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

حسرتِ شام و سحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
اُن پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے

یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب
اس کو مسکن کے لئے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
اور محرابِ شکستہ میں سمٹ کر پہروں
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے

ایک بوڑھا گدھا دیوار کے سائے میں کبھی
اونگھ لیتا ہے ذرا بیٹھ کے جاتے جاتے
یا مسافر کوئی آجاتا ہے، وہ بھی ڈر کر
ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے آتے آتے

فرش، جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
واقفِ قطرۂ شبنم بھی نہیں ہے حمّام
طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی
اب مصلّٰی ہے نہ ممبر، نہ موذن نہ امام

آچکے صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام
کوہ و در اب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبہ کی شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھو گئی دشتِ فراموشی میں آوازِ خلیل

چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دھلی چادر اپنی
اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ بس اک
چشمِ نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی

ایک میلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھاتے بھی نہیں
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے

تیز ندی کی ہر اک موجِ تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

محرومی

تو بھی تقدیر نہیں درد بھی پائندہ نہیں
تجھ سے وابستہ وہ اک عہد وہ پیمانِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
خواب انگیز نگاہیں وہ لبِ درد فریب
اک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں واماندہ سحر بیٹھ گئی
کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزلِ شوق
ایک امید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی!

ایک دوراہے پہ حیران ہوں کس سمت بڑھوں
اپنی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوں شاید
میں بھی گردشِ گہِ ایّام کا زندانی ہوں
دردِ دہی درد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید

زیرِ مژگاں تپشِ آہ کے پگھلائے ہوئے
جھلملاتے ہوئے تاروں سے مجھے کیا لینا
تیرے آنسو مرے داغوں کو نہیں دھو سکتے
تیرے پھولوں کی بہاروں سے مجھے کیا لینا

اپنے انجام کی تشویش اب آئندہ نہیں!

موت

"کون، آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم؟"
"آہ احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی
اور سرمایۂ انفاس پریشاں نہ رہا
میرے سینے میں اُلجھنے لگی فریاد مری
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ نگاہوں کا چراغ!
"اس قدر ہوش سے بیگانہ ہوئے جاتے ہو؟"
تم چلی جاؤ، یہ دیوار پہ کیا ہے رقصاں
میرے اجداد کی بھٹکی ہوئی روحیں تو نہیں
پھر نگاہوں پہ اُمنڈ آیا ہے تاریک دھواں

ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ یہ مایوس چراغ
آج ملتا نہیں افسوس تپنگوں کا نشاں
میرے سینے میں الجھنے لگی منحوس یاد مری
ٹوٹ کر رہ گئی انفاس کی زنجیر گراں
توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا!
"جی الجھتا ہے مری جان پہ بن جائے گی"
"تھک گیا آج، شکاری کی کماں ٹوٹ گئی
لوٹ آیا ہوں بہت دور سے خالی ہاتھوں
آج امید کا دن بیت گیا، شام ہوئی
زندگی! آہ یہ موہوم تمنّا کا مزار
میں نے چاہا بھی مگر تم سے محبّت نہ ہوئی
"کہہ چکے اب تو خدا کے لئے خاموش رہو!
"ایک موہوم سی خواہش تھی فلک چھونے کی
نہ تنگ، آلودِ محبّت کو تجھے سونپ دیا
سرد ہاتھوں سے مری جان مرے ہونٹ نہ سی
گر کبھی لوٹ کے آ جائے وہی سانولی رات
خشک آنکھوں میں چھلک آئے نہ بے سود نمی

زلزلہ، اف یہ دھماکا یہ مسلسل دستک
بے اماں رات کبھی ختم بھی ہوگی کہ نہیں؟

اُف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت
میرے سینے میں دبی جاتی ہے آوازِ مری
تیرگی، اُف یہ دھندلکا مرے نزدیک نہ آ
یہ مرے ہاتھ یہ جلتی ہوئی کیا چیز گری
آج اس اشکِ ندامت کا کوئی مول نہیں
آہ احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی
اور یہ میری محبت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی"

"کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو؟
"کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو!"

زلزلہ، اُف یہ دھماکا، یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو،
اُف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت
"کون آیا ہے ذرا اک نظر دیکھ تو لو؟"
"توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا!"

وداع

سُونی راہوں میں بگولے ہیں ابھی گرمِ سفر
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا

دُور مغرب کے کسی گوشۂ تنہائی میں
جس جگہ شام و سحر بیٹھ کے سستاتے ہیں
اپنی تقدیر، غمِ بارِ سفر سے تھک کر
اور پھر تازہ نفس ہو کے پلٹ آتے ہیں

کیا خبر میں بھی کسی روز پلٹ ہی آؤں!
پر کبھی تازہ نفس ہو بھی سکوں گا کہ نہیں؛
یہ بھی ممکن ہے کہ میں لوٹ کے آ ہی نہ سکوں
سانس بھر سانس ہے کچھ آہنی زنجیر نہیں

اور زنجیر بھی ہو گی تو کہاں تک آخر
ٹوٹ جائے گی کسی روز، ابد گیر نہیں
روز خورشید دہکتے ہوئے تانبے کی طرح
ایک لاوے کے سمندر میں ڈھلک جاتا ہے
اور اک خون اگلتے ہوئے چشمے کے قریب
چھوڑ جاتا ہے تذبذب میں سلگتی ہوئی شام
کیا خبر پاؤں مرا ساتھ بھی دیں گے کہ نہیں
کیا خبر کیا ہے مرے عزمِ سفر کا انجام؟
روک آنکھوں سے امڈتا ہوا سیلابِ الم
بیٹھ جائیں نہ کہیں میری امیدیں تھک کر
اجنبی دیس کی ویران گزرگاہوں میں
میں اگر پا نہ سکا عشرتِ منزل کا سراغ
لوٹ آؤں گا تند ہوریں تری سمت کبھی
گل نہ ہو جائیں کہیں تیرے دریچے کے چراغ
آہ یہ دیدۂ پرانشک میں امید کی ضو
خشک ہوتی ہے نہ سیلابِ فنا بنتی ہے

مُڑ کے نقشِ قدم چشمِ فسردہ سے نہ دیکھ
دیکھ وہ راہ گزر کانپ رہی ہے اب تک
میں جسے روند کے آیا ہوں باندازِ جنوں
کیا سفر موت ہے تو کانپ رہی ہے اب تک

کتنا دلکش ہے دھندلکا سا افق کے نزدیک
آسماں چوم ہی لینے کو ہے تقدیرِ زمیں
پھر مرا خون مچلتا ہے ارادے بن کر
پھر کوئی منزلِ دشوار بلاتی ہے مجھے
پھر کہیں دشت و جبل ڈھونڈ رہے ہیں مجھ کو
پھر کہیں دور سے آواز سی آتی ہے مجھے

اڑ چلا اوس کے مانند ستاروں کا ہجوم
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا!

فیصلہ

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں!
اپنے شوریدہ ارادے کو اپاہج کر لوں
اپنی مجروح تمنا کا مداوا نہ کروں؟
اپنی خوابیدہ محبت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصور کے سہارے کے لئے
ایک بھی شمع سرِ راہ جلایا نہ کروں
اپنے بے سود تخیّل کو بھٹک جانے دوں
زندگی جیسے گزرتی ہے گزر جانے دوں
چند لمحوں میں گزرنے کو ہے ہنگامۂ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر

سرد پڑنے لگا اُجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردشِ یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار فسانوں کا اثر ٹوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بہ کمر
سوچ میں ڈوب گئے راہ گزر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں

میں ابھی آخری مے نوش ہوں میخانے میں
دیکھتا کیا ہے مری سمت بڑھا جام بڑھا
لا صراحی کو مرے پاس شکستہ ہی سہی
چھیڑ ٹوٹے ہوئے تاروں کو کراہیں تو ذرا
سوچتا کیا ہے اندیل اور انڈیل اور انڈیل
سرد پڑتی ہوئی محفل کے تکدر پہ نہ جا
اپنے بیدار تفکر کی ہلاکت پہ ہنسوں
آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں

پُرانی فصیل

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سایے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن!

یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمعِ امید و تمنّا لَو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت کوئی کروٹ نہیں لیتی

خراب و شورہ آلودہ زمیں خاموش رہتی ہے
یہاں جھینگر نہ جانے کس زباں میں گیت گاتے ہیں
یہاں جو ہے متاعِ زندگی سے سرخرو ہو کر
مہذب بستیوں میں جا کے اکثر لوٹ آتے ہیں

یہاں شبنم کے قطروں میں نزاکت بھی نہیں ہوتی
یہاں بھیگی ہوئی راتوں میں ہنگامے نہیں ہوتے
یہاں کوئی کسی کی زلف سے کھیلا نہیں کرتا
یہاں دنیا سے اکتائے ہوئے اکر نہیں روتے

یہاں سورج شعاعیں پھینک دیتا ہے یہ مجبوری
مگر پھر بھی کسی گوشے میں کچھ تاریک سے خاکے
جنہیں کرنیں نظرانداز کر جاتی ہیں جلدی میں
بنا کرتے ہیں، بنتے ہی رہے ہیں اک زمانے سے

یہاں اسرار ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازو ہواؤں کے

یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پہ دفن ہیں گزری ہوئی تہذیب کے نقشے

مری نظروں نے قتل و خون، ہوس رانی بھی دیکھی ہے
یہاں جذبات بھی عریاں کیے ہیں کجکلاہوں نے
یہاں لوٹی ہوئی پونجی پہ ماتم بھی کیا آکر
یہاں تھک کر سہارا بھی لیا ہے بادشاہوں نے

مرے اک سمت اک دنیا ہے رنگارنگ کی مظہر
وہاں ہر طنز کا پہلو ہے ہر اک دل نوازی میں
کبھی میں اک اچٹتی سی نظر سے دیکھ لیتی ہوں
وہاں تضحیک کے نشتر چھپے ہیں چارہ سازی میں

وہاں سہمی ہوئی ٹھٹھری ہوئی راتوں نے دیکھے ہیں
دریدہ پیرہن، عصمت نگوں سر، بال آوارہ
گریباں چاک، سینہ وا، بدن لرزاں، نظر تیرہ
خمِ ابرو میں درماندہ جوانی محوِ نظارہ

وہاں احساس کی جنسِ گراں قیمت نہیں رکھتی
وہاں کا ہر نفس مانگی ہوئی دنیا میں رہتا ہے
مسرّت تول کر لیتے ہیں چاندی کی ترازو میں
خوشامد زندگی کی ہر ادا میں کارفرما ہے

وہاں عورت محض اک زہر آلودہ سا کانٹا ہے
جو چُبھ سکتا ہے لیکن درد کا حاصل نہیں ہوتا
وہاں شُہوَی نگاہیں گھورتی ہیں تنگناؤں میں
مگر سب دیوتا ہیں کوئی اہلِ دل نہیں ہوتا

ہر اک ناواقفِ منزل سمجھتا ہے کہ واقف ہے
وہاں سب رہنما ہیں کوئی منزل ہے نہ راہی ہے
وہاں چھینے ہوئے جذبے ہیں سرمایہ ادیبوں کا
صریرِ خامۂ نادار بھی شہرت کی پیاسی ہے

وہاں ہر فکر کی جدّت پہ طعنے پیش ہوتے ہیں
وہاں شاعر مشینوں کی طرح سانچوں میں ڈھلتے ہیں

وہی اُگلے ہوئے لقمے طبائع کا سہارا ہیں
انھیں ویران راہوں پر کھڑے ہیں آنکھ ملتے ہیں

اسی اک کوئے جاناں، موئے جاناں، روئے جاناں کو
سمجھتے ہیں کہ معراجِ تخیل ہے اگر باندھیں
قلم کی شوخیاں سب ختم کردیں ایک جنبش میں
کسی کو ہمسرِ کعبہ کہیں، شامِ سحر باندھیں

کہیں روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں ہر طرف ہر سُو
غلاظت آشنا جھلسے ہوئے انساں کے پتلے
یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے کوکھ پھٹ جاتی مشیّت کی
تمنّاؤں میں ان کی رات دن کھینچے گئے چلّے

غرض اک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں، نہ منزل ہوں، نہ جادہ ہوں

نئی صبح

کالے ساگر کی موجوں میں ڈوب گئیں دھندلی آشائیں
جلنے دو یہ دیئے پرانے خود ہی ٹھنڈے ہو جائیں گے
بہ جائیں گے آنسو بن کر روتے روتے سو جائیں گے
اندھے سایوں میں پلتے ہیں مبہم سے غمگین فسانے
دکھ کی اک دیوار سے آ کر ٹکرا جاتے ہیں پروانے
دودِ فسردہ کی انگڑائی مے بن بن کر ٹوٹ رہی ہے
سرخ زباں کی نازک لو پر جاگ رہی ہے ایک کہانی
ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں سونی سونی ہے کچھ محفل
دھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے کب سورج نکلے بستی جاگے غم مٹ جائیں

قلوبطرہ

شام کے دامن میں پیچاں نیم افرنگی حسیں
نقرئی پاروں میں اک سونے کی لاگ
رہ گزر میں یا خراماں سرد آگ
یا کسی مطرب کی لے، اِک تشنۂ تکمیل راگ

ایک بحرِ بیکراں کی جھلملاتی سطح پر
ضَو فگن افسانہ ہائے رنگ و نُور
نیلے نیلے دو کنول موجوں سے چور
بہتے بہتے جو نکل جائیں کہیں ساحل سے دُور

چاند سی پیشانیوں پر زرفشاں لہروں کا جال
احمریں اُڑتا ہوا رنگِ شراب
جم گئی ہیں اشعۂ صد آفتاب
گردنوں کے پیچ و خم میں گھل گیا ہے آفتاب

عشرتِ پرویز میں کیا نالہ ہائے تیز تیز
اُڑ گیا دن کی جوانی کا خمار
شام کے چہرے پہ لوٹ آیا نکھار
ہو چکے ہیں ہو رہے ہیں اور دامن داغدار
اس کا زرّیں تختِ سیمیں جسم ہے آنکھوں سے دُور
جامِ زہر آلود سے اُٹھتے ہیں جھاگ
چونک کر انگڑائیاں لیتے ہیں ناگ
جاگ انطونی محبت سو رہی ہے جاگ جاگ!

زندگی کے دروازے پر

پابرہنہ و سراسیمہ سا اِک جمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعلِ بے شعلہ و دُود
مضطرب ہو کے گھروندوں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ برسوں کا جمود!

ان ہونٹوں میں یہ تھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اُجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی درِ زیست کہاں ڈھونڈیں گی
ان کو وہ تشنگیٔ شوق میسّر ہی نہیں!

جیسے صدیوں کے چٹانوں پہ تراشے ہوئے بت
ایک دیوانے مصوّر کی طبیعت کا ابال
ناچتے ناچتے غاروں سے نکل آئے ہوں
اور واپس انہیں غاروں میں ہو جانے کا خیال

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
اور یہ رقصِ طلسمانہ کے رنگیں سائے
اس کی نظروں کو دیے جاتے ہیں پیہم دھوکا
جیسے بس آنکھ جھپکنے میں وہ اُڑ کر آئے

شہپرِ موت کسی غولِ بیاباں کی طرح
قہقہے بھرتا ہے، خاموش فضاؤں میں صدا
کانپتے کانپتے اک بار سمٹ جاتی ہے
ایک تاریک سا پردہ یونہی آویزاں رہا

کوئی دروازہ پہ دستک ہے نہ قدموں کا نشاں
چند پُر ہول سے اسرارِ تہِ سایۂ در

خود ہی سرگوشیاں کرتے ہیں کوئی جیسے کہے
"پھر پلٹ آئے یہ کمبخت وہی شام و سحر"

ناچتا رہتا ہے دروازہ کے باہر یہ ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعلِ بے شعلہ و دُود
زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر توڑ ہی دے بڑھ کے کوئی قفلِ جمود؟

جمود

تم سے بے رنگیٔ ہستی کا گِلا کرنا تھا

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا
آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میلہ ہے پریشان سی امیدوں کا
چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں
پُرمحن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے

ساقی و بادہ نہیں، جام و لبِ جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں!

آمادگی

ایک اک اینٹ گری پڑتی ہے
سب دیواریں کانپ رہی ہیں
ان تھک کوششیں معماروں کی
سر کو تھامے ہانپ رہی ہیں

موٹے موٹے شہتیروں کا
ریشہ ریشہ چھوٹ گیا ہے
بھاری بھاری جامد پتھر
ایک اک کر کے ٹوٹ گیا ہے

لوہے کی زنجیریں گل کر
اب ہمّت ہی چھوڑ چکی ہیں
حلقہ حلقہ چھوٹ گیا ہے
بندش بندش توڑ چکی ہے

چھونے کی اک تیلی سی تہ
گرتے گرتے بیٹھ گئی ہے
نبضیں چھوٹ گئیں مٹی کی
مٹی سے سر جوڑ رہی ہے

سب کچھ ڈھیر ہے اب مٹی کا
تصویریں، وہ دلکش نقشے
پہچانو تو رو دو گی تم!
گھر میں ہوں باہر ہوں گھر سے

اب آؤ تو رکھا کیا ہے
چشمے سارے سوکھ گئے ہیں
یوں چاہو تو آ سکتی ہو
میں نے آنسو پونچھ لیے ہیں!

اعتماد

بولی خوددسر ہوا ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں، موجِ دریا بڑھی
بولی میرے لئے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی میں، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا، میں سلیماں ہوں
ابنِ آدم ہوں میں یعنی انساں ہوں!

تنہائی میں

میرے شانوں پہ ترا سر تھا نگاہیں نمناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے!
گھر گیا ذہن غمِ زیست کے اندازوں میں
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیرِ خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا

اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
شب کے دامن پہ ہیں دھبّے سے سیہ کاری کے
اور مغرب کی فنا گاہ میں پھیلا ہوا خوں
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے

دُور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اس کے پیچھے سے جھلکتا ہوا اک گول سا چاند
ابھرا بے نور شعاعوں کے سفینے کو لئے

میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ اگر تو مل جائے
زندگی گو ہے گرانبار پہ اتنی نہ رہے!

چند آنسو، غمِ گیتی کے لئے چند نفس
ایک گھاؤ ہے جسے یوں ہی سئے جاتے ہیں
میں اگر جی بھی رہا ہوں تو تعجب کیا ہے
مجھ سے لاکھوں ہیں جو بے سود جئے جاتے ہیں

کوئی مرکز ہی نہیں میرے تخیل کے لئے!
اس سے کیا فائدہ جیتے رہے اور جی نہ سکے

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں

اُن کے قدموں پہ مچلتا ہو دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبّت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

یا کہیں گوشۂ اہرام کے سنّاٹے میں
جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں
ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کس کو پوجوں!

اب تو مغرب کی فنا گاہ میں وہ سوگ نہیں
عکسِ تحریر ہے اک رات کا ہلکا ہلکا
اور پُر سوز دھندلکے سے وہی گول سا چاند
اپنی بے نور شعاعوں کا سفینہ کھیتا
اُبھرا غمناک نگاہوں سے مجھے تکتا ہوا
جیسے گھل کر مرے آنسو میں بدل جائے گا
ہاتھ پھیلائے اِدھر دیکھ رہی ہو وہ ببول
سوچتی ہو کہ کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا

آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا

یوں گزارے سے گزر جائیں گے دن اپنے بھی
پہ یہ حسرت ہی رہے گی کہ گزارے نہ گئے

خون پی پی کے پلا کرتی ہے انگور کی بیل
گر یہی رنگِ تمنا تھا چلو یونہی سہی
خون پیتی رہی، بڑھتی رہی کونپل کونپل
چھاؤں تاروں کی شگوفوں کو نمو دیتی رہی
نرم شاخوں کو تھپکتے رہے ایام کے ہاتھ
یوں ہی دن بیت گئے، صبح ہوئی شام ہوئی
اب مگر یاد نہیں کیا تھا مآلِ امید
ایک تحریر رہے ہلکی سی لہو کی باقی
بیل پھلتی ہے تو کانٹوں کو چھپا لیتی ہے
زندگی اپنی پریشاں تھی پریشاں ہی رہی

چاہتا یہ تھا مرے زخم کے انگور بندھیں
یہ نہ چاہا تھا مرا جام تہی رہ جائے!

ہاتھ پھیلائے اِدھر دیکھ رہی ہے وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
گھر گیا ذہن غمِ زیست کے اندازوں میں
کیسا نالائق ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا!
کاش اس وقت کوئی پیرِ خمیدہ آکر
میرے شانوں کو تھپکتا غمِ تنہائی میں

ایک یاد

میرے دامن پہ کئی اشک ہیں اب تک تازہ
میرے شانوں پہ وہی جنبشِ سر ہے اب بھی
میرے ہاتھوں کو ہے احساس انہیں ہاتھوں کا
میری نظروں میں وہی دیدۂ تر ہے اب بھی
آج آہٹ بھی نہیں کوئی اشارا بھی نہیں
کسی ڈھلکے ہوئے آنچل کا سہارا بھی نہیں!

جواری!

گھر سائے ناچ رہے ہیں دیواروں پر محرابوں میں
سہمے ہوئے ہیں ہارنے والے جیتنے والے ہار رہے ہیں
پونجی نقدی جو کچھ بھی ہے لے کر داؤ مار رہے ہیں
چہروں پہ ہے موت سی طاری آنکھیں ناؤ گردابوں میں

مٹی آشا اکساتی ہے، کھیل جواری کھیل جواری
جو بھی ہارا ہار چکا ہے، اب کی بازی جیت سمجھنا
ہار بھی تیری ہار نہیں، یہ جیت نگر کی ریت سمجھنا
سانسیں قیدی خوف کے مارے گھیرے ہے اک چار دواری

تجھ سے پہلے اور جواری جیتے بھی ہیں ہارے بھی ہیں
ہار اور جیت کا سودا ہے یہ، ڈبدا کیسی، ڈرنا کیسا
پانسا پھینک جھجکتا کیوں ہے، جیتے جی ہی مرنا کیسا
ویرانوں میں، طوفانوں میں، سائے بھی ہیں سہارے بھی ہیں

ایک ہی بازی، ایک ہی بازی، کوئی بیٹھا اکساتا ہے
تن کے کپڑے، سر کی پگڑی، بیچ، یہ بازی اپنانی ہے
ہمچشموں میں بات رہے گی، بابا نوآنی جانی ہے
ہار بھی تیری ہار نہیں ہے، من کو من ہی سمجھاتا ہے

ہونٹ چبائے، پہلو بدلے، سب کچھ بیچا، بازی جیتی
پھر لالچ میں آ کر بیٹھے، آنکھیں جھپکیں، من لہرایا!
ایسے کھوئے، خود کو بھولے، کھیل میں کچھ بھی یاد نہ آیا
جب اُٹھے تو جیب تھی خالی، کون یہ پوچھے کیسی بیتی

گھرے سائے، اندھے دیپک ناچ رہے ہیں، جاگ رہے ہیں
دیواروں کے حلقہ میں ہے بازی، داؤ اور جواری

کیا جانے یہ اندھی بازی کس نے جیتی کس نے ہاری
کیا جانے کیوں سانجھ سویرا آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی!
سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے کون کسی سے بازی جیتے
بیت گئی ہے جیسی بیتی، باقی چاہے جیسی بیتے
وہم و جنوں کی زنگ و فسوں کی پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

تصوّر

پھر وہی مانگے ہوئے لمحے وہی جامِ شراب
پھر وہی تاریک راتوں میں خیالِ ماہتاب
پھر وہی تاروں کی پیشانی پہ رنگِ لازوال
پھر وہی بھولی ہوئی باتوں کا دھندلا سا خیال
پھر وہ آنکھیں بھیگی بھیگی دامنِ شب میں اُداس
پھر وہ امیدوں کے مدفن، زندگی کے آس پاس
پھر وہی فردا کی باہیں، پھر وہی میٹھے سراب
پھر وہی بیدار آنکھیں، پھر وہی بیدار خواب
پھر وہی وارفتگی، تنہائی، افسانوں کا کھیل
پھر وہی سرگوشیاں، سپنے، وہ دیوانوں کا کھیل

پھر وہی رخسار، وہ آغوش، وہ زلفیں سیاہ
پھر وہی شہرِ تمنا، پھر وہی تاریک راہ

زندگی کی بے بسی اُف وقت کے تاریک جال
درد بھی چھننے لگا، امید بھی چھننے لگی!
مجھ سے میری آرزوئے دید بھی چھننے لگی!
پھر وہی تاریک ماضی، پھر وہی بے کیف حال

پھر وہی بے سوز لمحے، پھر وہی جامِ شراب!
پھر وہی تاریک راتوں میں خیالِ ماہتاب!

پگڈنڈی

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا، دیکھ رہی ہے
جیسے یونہی بڑھتے بڑھتے رنگِ افق پر جا چھولے گی
جیسے یونہی افتاں خیزاں جا کر تاروں کو چھولے گی
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی شرماتی ڈرتی مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں سستاتی، مڑتی بڑھ جاتی ہے آزادی سے

راہی کی آنکھوں میں ڈھلتی، گرتی اور سنبھل جاتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں میں تاروں کی سیمیں خواب کا دھارا بنتی
دن کی روشن قندیلوں میں میداں میں آوارہ پھرتی
ندیوں سے چشموں سے ملتی کوسوں دُور نکل جاتی ہے

پھولوں کے اجسام، پگھلتی ذرّوں کے فانوس جگاتی
درماندہ اشجار کے نیچے، شاخوں کا واویلا سنتی
ہر نو وارد کے رستے میں نادیدہ اک جال سا بنتی
بڑھ جاتی ہے منزل کہہ کر کلیاں زیرِ خاک سلاتی

غم دیدہ پسماندہ راہی تاریکی میں کھو جاتے ہیں
پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بنا دیتے ہیں
آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں
وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہو جاتے ہیں

راہ کے پیچ و خم میں اپنا دامن کوئی کھینچ رہا ہے
فردا کا پُر پیچ دھندلکا ماضی کی گھنگھور سیاہی

یہ خاموشی، یہ سناٹا اس پر اپنی کور نگاہی
ایک سفر ہے تنہا راہی، جو سہنا تھا خوب سہا ہے

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یونہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

یہ سورج یہ چاند ستارے راہیں روشن کر سکتے ہیں
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے؟
آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں ہے؟
ہم سے اتنا بن پڑتا ہے جی سکتے ہیں مر سکتے ہیں!

جانِ شیریں

تم سے ہمیں اور کیا ملے گا
بربادیٔ دل، خرابیٔ جاں
دیکھو تو ذرا اتلیوں کا
تھوڑا سا اگر ہے کوئی امکاں
یہ گردشِ روزگار و غم سے
لمحے جو بچے ہیں جانِ شیریں
ہم بھی انہیں پائدار کر لیں!
آلام کو داغدار کر لیں!

مارچ ۵۳ء

سَحَر

کون سی راحتِ دوراں جو میسّر آئی
داغ دے کر نہ گئی، کون سے لمحاتِ نشاط
ٹیس بن کر نہ اٹھے، زہر نہ چھوڑا مجھ میں
ہر نیا واقعہ اک حادثہ تھا، ہر نئی بات
فالِ بد نکلی، کیا زخمِ دروں کو گہرا
ہر نئے موڑ پہ دنیا ہوئی ثابت وہ بساط
جس پہ انسان فقط مہرے ہیں الٹے سیدھے
پھر بھی وہ کون سا جادو ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی سے کہ نشاں بھی نہ ملیں

۲۵ مئی ۱۹۵۸ء

تاریک سیّارہ

آبادی

بگولے اُٹھتے تھے عنوانِ خاک و باد لیے
نہ شورِ بزمِ طرب تھا نہ دورِ شمعِ جمال
زمیں کے سینۂ سوزاں پہ کوئی بار نہ تھا
بہارِ یاسمن و لالہ کاشکار نہ تھا

کہیں سے آئے بگولوں کے ساتھ خانہ بدوش
نگاہ سوز جوانی نے کاروبار کیا
بنائے رنگ محل استخوان واعضا پر
بہار یاسمن و لالہ کو شکار کیا
سرودِ نالہ اُٹھا رقصِ ناتواں کے لیے
چھلکتے جام نے رندوں کا انتظار کیا

لہو تڑپ کے مچلنے لگا شبستاں میں
ہوا کسی کو محبّت کا امتحاں مقصود
تفنگ و تیر کی منزل پہ آیا عشقِ خموش
خمار بڑھنے لگا مستیاں شکار ہوئیں
دُہل بجا تو حدودِ مکاں شکار ہوئیں!

غبارِ راہ بنا کارواں کا سرمایہ
فضائے دشت میں پھیلا ہوا تھا رنگِ مآل
بگولے اٹھتے تھے عنوانِ خاک و باد لیے
نہ شورِ بزمِ طرب تھا نہ دورِ شمعِ جمال!

جَبرُ

زرد پتّوں کا وہی ڈھیر، وہی دَورِ خزاں
خشک شاخیں ہیں ابھی منتظرِ فصلِ بہار
مرگِ انبوہ سے کچھ کم تو نہیں ہے یہ سماں
کتنا جانکاہ تسلسل ہے، وہی لیل و نہار!

اس قدر ناز نہ کر بھول سے رخساروں پہ
زندگی بھیک ہے، جو جبرِ مشیّت سے ملی
حسنِ بے مایہ ملا تجھ کو، مجھے تشنہ دلی
ہم بھکاری ہیں، بھکاری کی حقیقت کیا ہے

ایک کشکولِ گدایانہ لیے پھرتے ہیں
منظرِ عام پہ، ویرانوں میں آبادی ہیں
سب ہی بے بس ہیں سبھی ہونٹ سیے پھرتے ہیں

اپنی مجبوری کا شاید تجھے احساس نہیں
ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج، یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے
اشک چھن جائیں نگاہوں سے حرارت چھن جائے
ظلم یہ ورده جوانی سے محبّت چھن جائے
حُسن اک ٹیس کی صورت میں بدل کر رہ جائے
ظلمتِ یاس میں اِک آہ مچل کر رہ جائے !

پس منظر

کس کی یاد چمک اٹھی ہے، دھندلے خاکے ہوئے اُجاگر
یوں ہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں، چپکا بیٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ ہڈی، کہیں کسی کا رُوپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پر دُھندلے دُھندلے نام کھدے ہیں، ہیں جیون بھر
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر،
مستقبل اور حال کو چھوڑے دُکھ سُکھ سب میں لیے پھرا ہوں
ماضی کی گھنگور گھٹا میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے، دُھندلے خاکے ہوئے اُجاگر

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں، ہوک سی بن کر ایک اک مورت
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں، دُور کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں "گذرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے، ہر جانی پہچانی صورت
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رشتے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے!

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے درد کے جس کو
اپنی رُوح سمجھ کر اب تک لیے لیے پھرتا تھا ہر سُو
لیکن آج اُڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو
جس میں آنسو بوئے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں، جو ہو
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے جو رہ جائے وہ اپنا لوں!

اعتراف

چند لمحے جو ترے ساتھ گذارے میں نے
ان کی یادان کا تصوّر ابھی رخشندہ نہیں
تو ابھی چھائی نہیں مجھ پہ، مری دنیا پر
خود ترا حُسن مرے ذہن میں تابندہ نہیں
کیا خبر کل مجھے یکسر ہی بدل ڈالے تُو
یوں ترا حُسن، مرا شوق بھی پائندہ نہیں
دیکھ، میں ہوش میں ہوں اے غمِ گیتی کے شعور
تیرے ملنے کی تمنا لیے آنکھوں میں کہاں
اپنے ظلمت کدے اے جان، سنوارے میں نے
غم چشیدہ مرے جذبات میں وہ جذبِ نہاں
اب کہاں، پہلے گذاریں کئی راتیں میں نے

جن میں افسانے کہے چاند سے افسانے سنے
اب کہاں، پہلے برس گذرے، کسی مہوش کی
چاہ میں، کتنے ہی ہنگامِ سحر گیت بُنے
اب مگر تاب نہیں مجھ میں، یہ انگور کی بیل
خون چاہے گی رگ و پے میں سما جائے گی
میں تجھے کیسے جگاؤں گا کہ بیدار ہے تُو
ہاں تری یاد مرے ذہن پہ چھا جائے گی
اب میں اس نشّہ سے گھبرانے لگا ہوں اے جاں
رُوح معصوم ہے، ٹھوکر کوئی کھا جائے گی

وہ تری گود ہو یا قبر کی تاریکی ہو
اب مجھے نیند کی خواہش ہے سو آ جائے گی!

انجان

تم ہو کس بن کی پھلواری آتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو، میں کیا جانوں میں ہوں کون
چلتا پھرتا آ پہنچا ہوں، راہی ہوں، متوالا ہوں،
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا روپ سجایا ہے
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا کھیل رچایا ہے
ان گیتوں کا جن کی دھن پر ناچ رہے ہیں میرے پران
ان لہروں کا جن کی رَو میں ڈوب گیا ہے میرا مان
میرا روگ مٹانے والی آتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون

میں ہوں ایسا راہی جس نے دیس دیس کی آہوں کو
لے لے کر پروان چڑھایا اور رسیلے گیت بُنے
چنتے چنتے جگ کے آنسو اپنے دیپ بجھا ڈالے
میں ہوں وہ دیوانہ جس نے پھول لٹائے خار چُنے
میرے گیتوں اور پھولوں کا رس بھی سوکھ گیا تھا آج
میرے دیپ اندھیرا بن کر روک رہے ہیں میرے کاج
میری جوت جگانے والی آتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون
ایک گھڑی اک پل بھی سکھ کا امرت ہے اس راہی کو
جیون جس کا بیت گیا ہو کانٹوں پر چلتے چلتے
سب کچھ پایا پیار کی ٹھنڈی چھاؤں جو پائی دنیا میں
اس نے جس کی بیت گئی ہو برسوں سے جلتے جلتے
میرا درد بٹانے والی آتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون

جب اور اب

کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت میں گدگدی سی تھی لوریوں کی
نئی نئی کونپلوں کی نرمی نئے شگوفوں کی تازگی تھی
کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت تھی گیت، اٹھتی جوانیوں کا
کہاں یہ دن ہے کہ تیری آواز بن گئی ہے صدائے صحرا
نہ جانے کس گوشۂ زمیں سے رکی رکی سی تھمی تھمی سی
گھٹی گھٹی سی ہزار پردوں سے آج چھن چھن کے آ رہی ہے!

اتفاق

دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہو ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گزر
جہاں ہجومِ گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے!

اجنبی

تُو ہے کچّی کونپل اب تک جس کے لوچ میں پیار ہی پیار
اور میں گرمی سردی جھیلے ڈالی پر اک تنہا پات

تُو سچا موتی میں ہیرا، بکھرا جو برسوں ہاتھوں ہاتھ
تُو اُوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات

تُو تاروں کے نُور کی دھارا، میں گہرا نیلا آکاش
میں ہوں جیسے ٹوٹتا نشّہ، تو ہے جیسے شاخِ نبات

تو ہے ایک ایسی شہنائی جس کی دھن پر ناچے موت
تیری دنیا جیت ہی جیت ہے میری دنیا، چھوڑ یہ بات!

تُو ہے ایک پہیلی جس کو جو بُوجھے وہ جان سے جائے
تُو ہے ایسی مٹّی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان

آئیں تیرا انگ بھی چھودوں، چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات
میں نے وہ سرحد چھولی ہے، جہاں امر ہو جائیں پران
اے آنکھوں میں کھبنے والی جانے کون کہاں رہ جائے
جیون کی اس دوڑ میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان
لیکن اے سپنوں کی مایا تو چاہے تو روگ مٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس دوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان!

عہدِ وفا

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لئے چشم نم ہو، یہاں اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچّی ملی تھی، جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا بیٹی!
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو، مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر
وہ کہنے لگی "میرا ساتھی، اُدھر، اس نے انگلی اٹھا کر بتایا، ادھر اس طرف ہی
جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں،
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی!"

تبدیلی

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سر پھرے"
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سُنیں اور کہیں
اور اس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی!
ایک دن کے لئے اپنا رُخ موڑ لے!

سجدہ

سیاہ رات بس اب ٹوٹنے ہی والی ہے
ہوا ہی چاہتا ہے دامن و گریباں چاک
اس آفتابِ سرِ آسمانِ الفت کا
بلا ہی چاہتا ہے بے قراریوں کو سکوں
کھلا ہی چاہتا ہے آبلوں پہ رنگِ حنا

خطِ افق پہ ابھی تیرگی ہے تھوڑی سی!
سیاہ پردے نگاہوں سے اٹھتے جاتے ہیں
غبار سا تھا سرِ راہ وہ بھی کچھ کم ہے

وہ سُرخ سُرخ شفق لے رہی ہے انگڑائی
یہ میری آنکھ خدا جانے آج کیوں نم ہے؟

لہو پکار رہی دے گا شہیدِ منزل کا!
تھکی ہوئی تھیں نگاہیں پناہ چاہی تھی
اسی گھڑی کا اسی دن کا انتظار بھی تھا
کوئی شریر کرن بڑھ کے چوم ہی لے گی
جبینِ شوق میں اک سجدہ بے قرار بھی تھا!

تعمیر

میں بھی تعمیر اک جہان کروں

بستیاں چند، غم کے مارے چند
مہ و خورشید اور تارے چند
ٹوٹنے والے ہوں سہارے چند

روشنی تیرگی میں کھو جائے
زندگی روتے روتے سو جائے
یہ حکایت دراز ہو جائے

بے کسی کا چراغ جلتا ہو
موت کے غم سے جی بہلتا ہو
ریگ زاروں میں خُوں مچلتا ہو

آسماں سے ہو کلفتوں کا نزول
لوٹ آئے دعا خموش و ملول
کھلنے پائے کبھی نہ بابِ قبول

میں بھی تعمیر اک جہان کروں!

واپسی

خاموش ہے گنگ ہے سیہ پوش
ماضی کے محل کی کہنہ دیوار
ٹوٹا نہیں بے حسی کا پندار
چھوڑا تھا اسی محل کے پیچھے
احباب کو صرف نغمہ و ساز
رکھتے تھے شرارتوں کی بنیاد
ہوتا تھا محبتوں کا آغاز
پلٹا ہوں تو محفلیں ہیں خاموش
آتی نہیں قہقہوں کی آواز
زنداں کی حدوں میں کھو گئے ہیں
دیوانے بہل کے سو گئے ہیں

دروازوں پہ دے رہا ہوں آواز
خاموش ہے گنگ ہے سیہ پوش
ماضی کے محل کی کہنہ دیوار
پھیلائے ہوئے زمیں ہے آغوش

تاریکی میں ڈھونڈتا ہوں راہیں
سورج کو ترس گئیں نگاہیں!

دستک

کھٹکھٹاتا ہے درِ خفتہ کوئی!
انتظار، اشک، گماں، کچھ بھی نہیں
شمع، پروانے، دھواں، کچھ بھی نہیں

سوچ لوں باز کروں در، نہ کروں
شیشہ و سنگ کی جھنکار سنوں
آج کیا کہتے ہیں غم خوار سنوں

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا!

قیامت

بارگاہِ لافانی
بے خبر ہے جانے کیوں؟
ایک اشکِ بے مایہ!
معتبر ہے جانے کیوں؟

ہم نفس دعا مانگیں
رُوشنی کے مینارے
ماہ و آسماں کے تارے
ٹوٹ کر بکھر جائیں
کوہ و دشت و دریا سے
کانپتی صدا اُٹھے

اے خدائے لافانی
مختصر جہانبانی"

مُدتوں کی تاریکی۔
روشنی سے ڈھل جائے
چشمۂ بقا پھوٹے!
آسمانِ تازہ پر
آفتابِ تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
موت کا جنازہ ہو!

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسمِ خاکی
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دُنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حسنِ گمنام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے
جوان، دلکش، حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی
کھلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے

اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی
اسی لئے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلا دیں؟

شکوہ

خدائے عالم، بلند و برتر
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
محبتوں کے لطیف دامن
مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں
یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن

سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں
نئے شگوفے، نئی بہاریں
فرازِ کوہِ گراں سے گرتی
ہیں تند اور تیز آبشاریں

مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر میں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رلا کر
خدائے عالم، بلند و برتر
نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے ساتھ مر سکوں میں ؟

پہلی کرن

"صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی"
تاروں بھری حسین رات، نرم رواں جوان شام
کھوئی ہوئی سی اک ہنسی، بھولا ہوا سا اک خرام
موت کی وادیوں میں گم ہو گئی پھر وہ نغمگی!
فرشِ زمیں پہ خار و خس پرتوِ خور سے جاگ اٹھے
شعلۂ و دود جاگ اٹھے آہن و سنگ جاگ اٹھے
رنج و الم کے شاہکار، لے کے امنگ جاگ اٹھے
جاگ اٹھے ہیں قہقہے تیز، بلند قہقہے
رات کی خواب گاہ میں بجھ گئے شب چراغ پھر
پہلی کرن کے ساتھ ساتھ جاگ اٹھے دل کے داغ پھر!

تجھے گماں ہے...

تجھے گماں ہے مری محبّت ترے کرم سے جواں ہے شاید
مری جوانی، تری جوانی کی بے رُخی کا شکار ہوگی
مرا لہو میرے اشک بن کر سیاہ راتوں کی نذر ہوگا
یہ وسعتِ کائنات شاید حکایتِ انتظار ہوگی!

مرے لبوں پر سلگ رہا ہے طویل زلفوں کا ایک بوسہ
ترے تبسّم کی یاد باقی ہے زہر کے گھونٹ پی رہا ہوں
مرے تخیل کی تنگ دنیا ترے تصوّر سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تری تمنا میں جی رہا ہوں

تجھی سے سیکھا ہے میرے نغموں نے سنگ و آہن کو موم کرنا
ترے لبوں کی شگفتگی سے ہی میرے شعروں میں تازگی ہے
تری ہی پُرکار سادگی سے مرے جہاں میں ہے حشر برپا
ترے ہی دلکش حسین چہرے سے میری آنکھوں میں روشنی ہے

یہ شورشِ غم، جنونِ پیہم، مرے لئے کچھ نئے نہیں ہیں
تجھے گماں ہے گذر رہا ہوں میں تیری الفت کے امتحاں سے؟
تجھے مری سخت کوشِ فطرت سے جانِ غم آگہی نہیں ہے
تجھے گماں ہے کہ اب میں شاید نہ اٹھ سکوں تیرے آستاں سے؟

تری محبت بھری نگاہوں کی دلکشی بھولتا نہیں ہوں
مگر ترا آستاں نہ چھوٹے گماں ہے میں نقشِ پا نہیں ہوں!

سلسلے ٹوٹ گئے

اٹھ گیا رات کے چہرے سے ستاروں کا کفن
سبزۂ و گل پہ ابھی تک ہے وہی پہلا نکھار
صبح کی آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے خمار

دن کے ہمراہ چلا قافلۂ رنگ و بہار!
سینۂ خاک پہ رقصاں ہے وہی روحِ حیات
وہی کلیوں کی خموشی، وہی غنچوں کا ثبات

نورِ خورشید سے ذرّوں کی جبیں روشن ہے
دشت و کہسار میں ہے پھر وہی کرنوں کا خرام
پھر وہی شور، وہی کشمکشِ دانۂ و دام

پھر اسی مرکزِ آلام پہ لوٹ آیا ہوں
پھر وہی حسن سے حیوان کی چارہ جوئی
پھر وہ انسان سے انسان کی چارہ جوئی

سلسلے ٹوٹ گئے خواب کی زنجیروں کے
میری پلکوں پہ ستارے سے لرز کر ٹوٹے
اس کے ہونٹوں پہ سہارے سے لرز کر ٹوٹے!

تجدید

ایک بار پہلے بھی نغمہ بار تھیں شاخیں
برگ و بار آئے تھے، نخل پھول لایا تھا
لد گئی تھی پھولوں سے خاکِ بے سروساماں
ایک بار پہلے بھی میں نے گھر سجایا تھا

ایک بار پہلے بھی قافلے بہاروں کے
اوڑھ کر ردائے گل اس طرف سے گزرے تھے

آپ ہی نہ جانے کیوں بجھ گئے دیے گھر کے
ایک شعلۂ غم سے خاک ہو گئی محفل

نیشِ خار، پھولوں کے دل میں چبھ گیا جا کر
قافلے بہاروں کے لٹ گئے سرِ منزل

ایک بار پہلے بھی تیرگی کے دامن میں
مرگِ نغمۂ گل پر آنسوؤں سے کھیلا ہوں

آج تم نے پھر آ کر سب دیے جلائے ہیں
غمکدے کی دیواریں جگمگا اٹھی ہیں پھر!

پس و پیش

خلش ہے مرگِ تبسم کی میرے پہلو میں
جِلو میں رفتہ بہاروں کو لیکے آتی خزاں
کوئی نہیں بھری دنیا میں ہم نفس میرا
وہ راہرو ہوں جسے ہر قدم پہ ہے یہ گماں
یہ سنگِ میل کہیں سنگِ رہ نہ بن جائے
کہیں فریب نہ ہو شوقِ منزلِ جاناں
کہیں نہ ظلمتِ شب گھیر لے سرِ منزل
سیاہ رات نہیں میرے درد کا درماں!

میں ارضِ لالہ و گل چھوڑ تو نہیں آیا
یہ خار زار نہ ہو جس کی سمت لپکا ہوں
ہر ایک گام پہ یہ سوچ کر سنبھلتا ہوں
یہ راہِ مرگ نہ ہو اور تو بے خبر رہرو!
متاعِ یک نفسِ سوختہ بھی کھو بیٹھے
جلا نہ دے ترے ہونٹوں کو آتشِ گلِ نو

تاریک سیّارہ

"ہر فرد اس تاریک سیارہ کی مخلوق ہے
ہر فرد نے اس تاریک سیارے کو اپنے
دل میں چھپا رکھا ہے، اس چٹان کے
سینے سے روشنی کی کرن کب پھوٹے گی؟"

تاریک سیّارہ
(ایک کشمکش)

حریفِ اوّل　　خواب

حریفِ دوم　　حقیقت

"جانِ من حجلۂ تاریک سے نکلو، دیکھو
کتنا دلکش ہے یہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کی مانند حسیں
خلا میں دودھ کی اک نہر سی ہے کاہکشاں!"

"آسماں خود ہی نگوں سر ہے اسے کیا دیکھیں
رات کے پاس ہے کیا مرگِ تبسم کے سوا
جس کے ذرّوں میں ہے اب تک مرے ماضی کا لہو
میں نے باندھا ہے اسی خاک سے پیمانِ وفا"

"دن کے واماندہ، اسی دامنِ شب میں اکثر
اپنی منزل کے حسیں خواب میں کھو جاتے ہیں
یا کسی سادہ و پُرکار کی میٹھی یادیں!
اپنے پہلو میں دبائے ہوئے سو جاتے ہیں"

"میں بھی کھیلا ہوں تصور سے کسی کے برسوں
میں بھی اک حلقۂ صد رنگ کا زندانی تھا
اب مگر چاہتا ہوں ورطۂ شب سے نکلوں
وہ بھی دن تھے کہ کوئی وجہِ پریشانی تھا

رات کے پاس ستارے بھی ہیں سیارے بھی
دامنِ شب میں اندھیرا ہی نہیں نور بھی ہے
ایک سیارہ محبت کی نئی دنیا ہے
جس میں ایمن بھی ہے، موسیٰ بھی ہے اور طور بھی ہے!"

"آسمان دور ہے، نزدیک ہے یہ تودۂ خاک
جس کی آغوش میں ہیں رنگ کے چشمے رقصاں

جس میں ہے نکہتِ گل، بوئے سمن، بادِ نسیم
جس میں ہیں سبزہ و شبنم کے فسانے غلطاں!"

"ہر نفس جس میں ہے پابندِ غمِ دورِ خزاں
صبح کی آنکھ میں اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں؟
قسمتِ حسن ہے رسوائیِ ہر دو عالم
کائنات عشق کی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں؟"

"اور وہ سیارے جو ہیں میری نظر سے اوجھل
ان میں کیا سلسلۂ کشتی و طوفان نہیں؟
شیشہ و سنگ نہیں، شعلہ و شبنم بھی نہیں
تم یہ کہتے ہو کہ اس دنیا میں انسان نہیں"

"میری نظروں سے نہاں راز ہیں اب تک اس کے
اتنا معلوم ہے خوشیاں ہیں وہاں مستِ خرام
حسن و موسیقی نے اک جال سا بن رکھا ہے
سایۂ گل میں کوئی ہو گا مگر دست بہ جام"

"جی کو بہلایا فسانوں کا سہارا لے کر
خواب میں زلف و رُخِ جانِ تمنا دیکھا!
آتشِ گل سے جلا ڈالے اندھیرے میں چراغ
ڈوبنے والوں نے کشتی کا تماشا دیکھا"

"ہر نفس خواب ہے ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا، نہ ماضی ہو نہ حال
آج ماضی ہے وہی دور، جو فردا تھا کبھی
موت ملتی ہے تمناؤں کے چہرے پہ گلال!"

"جو سمجھتے ہیں حقیقت کو محض نقشِ خیال
تم بھی ہو اور بھی ہیں، ایک سے انبوہِ کثیر
جو ابھی تک ہے پسِ پردۂ تاریکیٔ شب
جو ابھی تک ہے زمیں چھوڑ کے تاروں کا اسیر"

"خاک داں تیرہ و تاریک ہے شمعیں بے نور
اس اندھیرے میں یہ کہتے ہو ستاروں سے نہ کھیل

میں اسے خواب نہیں بلکہ حقیقت سمجھوں
مجھ سے یہ کہتے ہو نادیدہ بہاروں سے نہ کھیل"

"ساحلِ بحر پہ تسکین خزف ریزوں سے
وادیٔ مرگ میں نادیدہ بہاروں کی لگن؟
یہ اگر زادِ سفر ہے تو مسافر کے لئے
بالشِ خاک پہ بہتر ہے ستاروں کا کفن"!

"اور کیا ظلم و جہالت کے درِ دولت پر
پڑ رہوں خاک بسر ناصیہ فرسائی کروں
چھوڑ کر دامنِ سیّارہ و ماہ و انجم
حسنِ مغرور کے قدموں پہ جبیں سائی کروں"؟

"آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو!
سب اسی ارضِ سیہ بخت کی خاطر ہیں یہ کھیل
خاک پروردہ نظاروں کی طرف دیکھو تو!"

"چند مرجھائی ہوئی کلیاں ہیں، مسلے ہوئے پھول
درد ساماں بہاروں کی طرف کیا دیکھوں؟
جو پلے ظلمت و اندوہ کے گہوارے میں
ان نظر سوز نظاروں کی طرف کیا دیکھوں؟"

"ظلمتِ خاک میں پوشیدہ ہے آبِ حیواں
قسمتِ سوختہ ساماں ہے بدلنے ہی کو رنگ
اور کچھ دیر لہو ہولے دلِ خانہ خراب
محفلِ درد سے اٹھنے ہی کو ہے نغمۂ چنگ

"پھر تصور نے تراشی ہے پناہ گاہ نئی
تودۂ خاک ہے کیا سامنے سیاروں کے
زندگی اب تو حنائے سرِ ناخن بھی نہیں
موت کو دینے لگی چہرے یہ بیماروں کے"

"آسماں دور ہے اب خوابِ گراں سے اٹھیے
ظلمتِ شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن
اس کو انساں نے کر رکھا ہے خود تیرہ و تار!"

خاک و خوں

"خون خاک میں جذب ہو جاتا ہے اور شگوفہ
بہار بن کر پھوٹتا ہے، تاریک سیاہی کے
ہر تودۂ خاک میں اس بہار آفریں
مستقبل کی قوتِ نمو ہے۔ جو نئی انسانیت
کی تمہید بنتی رہتی ہے۔"

خاک و خون

ایک مکالمہ

کردار :-

قوّتِ نمو

راہی

"کیا ہوئی آپ کی وہ گرمیٔ گفتار و نگاہ
اب نہ پہلی سی وہ باتیں ہیں نہ افسانہ کوئی
قہقہے سوگ میں ڈوبے ہوئے آنکھیں مغموم
جیسے صحرا سے چلا آتا ہو دیوانہ کوئی!"

" وہ تھکا ہارا ہوں میں جس کو ہے سورج کی تلاش
مجھ سے یہ تیرگیٔ شب نہیں دیکھی جاتی
پھول مرجھائے ہوئے ڈالیاں بے برگ و ثمر
سرنگوں شاخ کوئی اب نہیں دیکھی جاتی"

"پراسی تیرگی شب میں ستارے بھی تو ہیں
میں تو ہلکی سی کرن لے کے بھی جی لیتی ہوں
اس مسرت کے سہارے یہ جو آئے گی کبھی
کتنے ہی تلخ ہوں آنسو انہیں پی لیتی ہوں"

"جگنوؤں ہی سے اندھیرے میں بہل جاتی ہو
موت پھیلائے ہوئے راہ میں ہے دام ابھی
ساتھ دے سکتے ہیں کب تک یہ سہارے یہ خیال
آدمی پوج رہا ہے وہی اصنام ابھی"

•

"موت بڑھتی ہوئی طاقت سے نہیں لڑ سکتی
تیز دریا کی روانی میں خس و خاک کبھی
کتنی یورش کریں دیوار نہیں بن سکتے
آپ ہوں، میں نہیں انسان سے مایوس ابھی"

"مجھ کو دنیا کے خم و پیچ کا اندازہ ہے!
جس کی بنیاد میں خون ہے وہی تعمیر ہے یہ

جس کی دیوار ہی کج ہو وہ محل کچھ بھی نہیں
آدمی ہی کی تراشی ہوئی تقصیر ہے یہ"

"آپ کیا جانیئے اس وہم سے کب نکلیں گے
منتظر راہگذار حسنِ شفق، نقشِ بہار
کتنی تسکین کے سامان ہیں آنکھوں کیلئے
دلِ بے تاب یہ کہتا ہے انہیں بڑھ کے پکار"

"اک بدلتے ہوئے رنگوں کا تلاطم ہے یہ سب
جن کی قیمت اسی انسان نے اتنی دی ہے
جو نہی آنکھیں ادھر اٹھتی ہیں کہ بھر آتی ہیں
ایک فریاد ہے جو روح نے اکثر کی ہے"

"اور یہ زرد سے دانے جو شگوفوں کو لئے
پردۂ خاک سے آجاتے ہیں بالائے زمیں
شبنمی، سبز، لبادوں سے جھلک دیتے ہوئے
ان کی قوت کا بھی کیا آپ کو اقرار نہیں؟"

"سب خزاؤں کی امانت ہیں یہ نوزائیدہ کھیل
یہ شگوفے، یہ گل و لالہ و نسرین چمن
صبح ہنستی ہوئی آتی ہے بہاروں کو لیے
شام روتی ہوئی جاتی ہے لیے گردِ محن"

"آپ ہوں، ہیں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے ابھی کمسن ہے بہار
شبنمی، سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک و خوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار"

جب آنکھ کھُلی تو.....

جب آنکھ کھلی تو.....

(چار تصویریں)

کھیل
زخم
وسوسہ
رہگذار

(۱)

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گل
پھولوں کی زباں میں اک کہانی
ہر برگ و شجر سے کہہ رہا تھا
مقصود تھی دل کی ترجمانی
چہروں سے سرک رہے تھے آنچل
مصروف تھی کھیل میں جوانی
ہر عضو سے پھوٹتے تھے نغمے
آنکھوں سے شراب ڈھل رہی تھی
جسموں سے اُبھر رہی تھیں تانیں
ہر پہلو میں آگ جل رہی تھی

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
رنگوں کی گھلاوٹوں میں گم تھا

(۲)

چھاگل سے اٹھی جو تان غم کی
آنکھوں سے لہو کی دھار پھوٹی
سینے میں دھواں سا پیچ کھا کر
اس طرح اٹھا کہ آس ٹوٹی
سر جھک گیا داغ مسکرائے
تاریکی میں پھلجھڑی سی چھوٹی
وہ قوسِ قزح وہ دستِ رنگیں
کیا جانے سمٹ کے رہ گئے کیوں
اک سیمگوں رات میں نہ جانے
آنسو آنکھوں سے بہ گئے کیوں

میں تھا کہ بھٹک رہا تھا ہر سُو
ہر خواب سلگ رہا تھا دل میں!

(۱۳)

اک وہم سے بیش تھا نہ کچھ بھی
ساحل تھا نگاہ میں نہ طوفاں
ہر چیز تھی رنگ و بو سے خالی
صحرا کہسار اور گلستاں
میں خود ہی تھا رنج و غم کا خالق
میں خود ہی تھا دست فرد گریباں
ہر چیز میں رنگ بھر رہا تھا
میں خود کو فریب دے رہا تھا
میں خود سے الجھ رہا تھا اب تک
خشکی ہی میں ناؤ کھے رہا تھا

پھر خواب سے چونک اٹھا سنبھل کر
ہر شے تھی حقیقتِ مجسم

(۴)

مغموم تھا وقت، راہ مسدود
چھائے ہوئے تھے سیاہ بادل
ہر نغمہ خموش ہو چکا تھا
پاؤں سے الجھ چکی تھی چھاگل
کمھلائے ہوئے تھے دستِ رنگیں
چہروں سے سرک چکے تھے آنچل
اِک اور ہی سمت تھیں نگاہیں
آنکھوں سے خیال بہ گئے تھے
تاباں تھی افق پہ خوں کی لَو ۔
اوہام سلگ کے رہ گئے تھے

تاروں کے سہارے چل رہے تھے
سورج کی تلاش میں تھے راہی

ایک کہانی

ایک کہانی

کردار :-

ماضی (حزنیہ کورس)

آدمی

محبوبہ

باغی

باغیوں کا گروہ نمبر ۱

باغیوں کا گروہ نمبر ۲

مستقبل

محلِ وقوع :- تاریک سیارے کا ایک ملک

زمانہ :- حال

تماشائی :- من و تو

ماضی (خزنیہ کورس) کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

آدمی :۔ رنگ و نور کی موجیں جس میں

رات کے بندھن توڑ چکی تھیں

ٹوٹ چکے تھے ظلم کے پھندے

پیار کے ناتے جوڑ چکی تھیں

جب تھی دنیا تاریکی میں

اس دھرتی پر سُورج چمکا

دُودھ کی دھاریں رس کی بوندیں

پی پی کر ہر بیتّہ جاگا!

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

محبوبہ :- سب دھرتی کے بیٹے مل کر
گیت محبت کے گاتے تھے
اوروں کا دکھ اپنا دکھ تھا
غیر کی آگ میں جل جاتے تھے
تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر
دھرتی ماں کا پیار جگاتے
جگمگ جگمگ کرتے دن میں
اپنی محنت کا پھل کھاتے
الفت کے بھو کے ننھے سارے
خون کے پیاسے کیونکر ہوتے
جھوٹ اور لوبھ کا سودا کرکے
کیسے خود آرام سے سوتے
دھن دولت تھا، پیار کی باتیں
اپنے دن تھے اپنی راتیں

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

محبوبہ :- دریا جھرنوں اور چشموں سے

ہلکے ہلکے راگ اُبلتے
جب سورج کی کرنیں پڑتیں
پھول اور کلیاں آنکھیں مَلتے
میٹھی میٹھی نیند سے اُٹھتے

دن جاتا اور رات کا راجا
نور کی کشتی لے کر آتا
"چندا ماموں گیت سنا جا"
سب کہتے وہ پیار لٹاتا
دن کا سندیسہ دیتا جاتا

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

(افق میں اک شور پیدا ہوتا ہے چیخیں بلند ہوکر دب جاتی ہیں)

آدمی :- ہری بھری کھیتی کا دشمن
اک پاپی باہر سے آیا
پیار کے رشتے ناتے توڑے
اس نے موت کا کھیل رچایا
آگ کی مدھم آنچ بڑھا کر
گھر بچھونے ہنستوں کو رُلایا

ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوا میں
زہر ملایا، خون بہائے
لوہے کی زنجیریں ڈھالیں
نفرت کے پھل پھول اُگائے
سچ پر جھوٹ، خوشی پر غم نے
اپنے اپنے تیر چلائے

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا
محبوبہ :- موت کا تحفہ لے کر آئے

باہر سے پاپی بیوپاری
ہار گئے اُلفت کے گاہک
مات ہوئے جیون کے پجاری
پیار بھری مٹی سے پھوٹے
آگ کے شعلے خون کے دھارے
ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوا میں
ناچے نفرت کے انگارے
رات ہوئی اور تاریکی میں
موت کے ظالم بازو پھیلے

سناٹے میں چیخ سی گونجی!

اُبھرے سائے میلے میلے

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

(ہر طرف ایک سناٹا چھا جاتا ہے)

آدمی :- موت کے شہپر گونج رہے تھے

رات اندھیری طوفانی تھی

نُور کے بازو کانپ رہے تھے

راہ نئی اور انجانی تھی

اک باغی نے مشعل لے کر

مُدّت کے مُردوں کو جگایا!

آنے والے دن کا سندیسہ

لے کر قبرستان میں آیا

(رات کی تاریکی میں مشعل آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے اور قریب آتی جاتی ہے)

باغی :- اٹھو! نیند کے ماتو جاگو!

رات نے دن کو گھیر لیا ہے

دھرتی ماں کے بیٹو جاگو!

ماں نے تم کو یاد کیا ہے

اس کی رُوح امر ہے لیکن
تم کو آج امر ہونا ہے
خون کی ہولی کھیل کے سونا
سکھ کی نیند اگر سونا ہے
پیاسی مٹی دیکھ رہی ہے
اس پہ جیون رس برسا دو
رنگ رنگ کے پھول کھلیں گے
سوئے ہوئے پودوں کو جگا دو
خون تمہارا رنگ لائے گا!
رات گئی، اب دن آئے گا!
(یہ مشعل نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے)

آدمی :- آگ اور خون کے فتنے جاگے
اور وہ نفرت کے بیوپاری
موت کا راگ سناتے اُٹھے
جاگ اٹھے جیون کے پُجاری
پھر پیاسوں کی پیاس بجھانے
سچ اور پیار کی جوت جگانے

(پس منظر سے ایک ساتھ بہت سی مشعلیں ابھرتی ہیں
باغی کی آواز کے ساتھ اور بہت سی آوازیں ہیں)

باغیوں کا گروہ :- رات گئی اب دن آئے گا!
جاگ اُٹھے ہیں نیند کے ماتے
موت کے دروازے سے گزرو
آزادی کا گیت سُناتے

دوسرا گروہ :- آزادی انسان کا حق ہے
ہر ذی رُوح کا ہر انساں کا
اب ہم موت سے ٹکرائیں گے
زور گھٹائیں گے طوفاں کا

پہلا گروہ :- اس دھرتی کا ذرّہ ذرّہ
اپنے خُون سے رنگیں کر دو
نفرت کے سب کانٹے چُن لو
اور دُنیا کو پیار سے بھر دو

دوسرا گروہ :- آنے والی نسلوں کا دن
نور کا دامن پھیلائے گا
پھُول بنیں گی نورس کلیاں
جب ننھا آدم آئے گا!

پہلا گروہ :- نور ہو، تاریکی سے اُبھرو
موت کے دروازے سے گزرو
آزادی کا گیت سُناتے!
آزادی کا گیت سُناتے!!
آزادی کا گیت سناتے!!!

مستقبل :- اٹھو! نیند کے ماتو جاگو!
دھرتی ماں کے بیٹو جاگو!!
آزادی کا گیت سناتے
آزادی انسان کا حق ہے
آزادی انسان کا حق ہے
آزادی انسان کا حق ہے!

ابھی نہیں...!

ابھی نہیں، ابھی منزل ہزار کوس ہے دُور
یہ ولولے، یہ مسرت، یہ ناتمام اُمنگ
یہ آب و رنگ سے بھرپور جامِ نغمۂ چنگ
بہت ملیں گے ابھی رہ میں چشمہ ہائے سرور!

ٹھہر ٹھہر دلِ مضطر یہ ننگ و نام نہ کھو
جنونِ شوق کا کمبخت احترام نہ کھو
ہزار لالہ و گل سنگِ راہ بن جائیں
ہزار جسمِ فسوں گر نگاہ بن جائیں

ہزار پاؤں مسافت کے بار سے ہوں چُور
ابھی نہیں، ابھی منزل ہزار کوس ہے دُور

طلوعِ صبح سے لے نُور، شامِ غم کے لیے
غبارِ شام کی تاریکیوں سے ہو نہ ملول
ابھی فضا میں حلاوت نہیں ہے تلخی ہے
ابھی کھلا نہیں انسان پر وہ بابِ قبول
جہانِ تیرہ میں برسے جہاں سے رنگ و نُور
ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دُور!

ایک پرتو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لیے ہیں آغوش میں وہ دُنیا
جہاں ابھی محوِ خواب ہوں گی وہ سُرمگیں غم فروز آنکھیں
ہر اک شجر سو گیا، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہر ایک شاخِ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئیں ہیں باہیں!
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریبِ صبحِ بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیّل سے ایک پرتو ابھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تمنا سے کھیلتی ہیں مآل ہو کر
یہ شب کی حسرت بدوش مستی جو چھوڑ دیتی ہے آزما کر
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے
حسین امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے!

سکون

نہ زہرخندہ لبوں پر، نہ آنکھ میں آنسو
نہ زخم ہائے دروں کو ہے جستجوئے مآل
نہ تیرگی کا تلاطم، نہ سیلِ رنگ و نور
نہ خارزارِ تمنا میں گمرہی کا خیال
نہ آتشِ گل و لالہ کا داغ سینے میں
نہ شورشِ غمِ پنہاں، نہ آرزوئے وصال
نہ اشتیاق، نہ حیرت، نہ اضطراب، نہ سوگ
سکوتِ شام میں کھوئی ہوئی کہانی کا
طویل رات کی تنہائیاں نہیں بے رنگ
ابھی ہوا نہیں شاید لہو جوانی کا

حیات و موت کی حد میں ہیں ولولے چپ چاپ
گذر رہے ہیں دبے پاؤں قافلے چپ چاپ

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہو گی وہ شام کیف آگیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رُخ پہ تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اک سہانی سی
مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہوا اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے دلوں کے سرمائے

نہ سنگِ میل نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی

ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے ذرّے
بھٹک رہے تھے بگولے سے رہنما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دل میں کبھی شوقِ بیکراں لے کر
چلے تھے بارِ زمیں سوئے آسماں لے کر

دلوں کا درد، نگاہوں کا سوز کام آیا
"دیارِ ہو" میں لبوں پر کسی کا نام آیا

یہ کاروبار، یہ محفل، یہ ریگ زار، یہ دھوم
سرودِ نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں
صدائیں کھوئی ہوئی وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں حل کردہ رنگ شام کہیں
حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اس وقت آسرا نہ ہوئے

میں اُستخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا
"دیارِ ہو" میں پریشاں خیال آوارا
اِسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے
اس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھٹکارا

پھر ایک شام ترے حسنِ لازوال کی خبر!
صدائیں آئیں، اِدھر آ، ترے مآل کی خیر!

پھر ایک بار تصوّر کے رنگ محلوں میں
ہجومِ شوق ہوا، شورِ ناؤ نوش ہوا
دیے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے
حیاتِ رفتہ کا افسانہ بارِ گوش ہوا

تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم ربا نغمے
بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے

سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سو
مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے
خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑایا میں
کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے
بڑھایا دستِ تمنا کہ دامنِ اُمّید
کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھٹ جائے

تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں
بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں یوئی تھیں

نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں، نہ وہ شب و روز
کبھی سمٹتی کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود
ٹھہر گئی ہے اک ایسے مقام پر دنیا
جہاں نہ رات، نہ دن ہے نہ بجلی، نہ جمود!
پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں
ہر ایک شے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود

میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائیں
خزاں بدوش بہاریں، خمارِ زہر آلود!

پکار

کیا خبر تاب گفتگو نہ رہے
آہ یہ لمحات پھر نہ آئیں گے
سانس لیتے میں چونک اٹھتا ہوں
رشتے نازک ہیں ٹوٹ جائیں گے
دن ڈھلا شام ہو اداس اداس
ایک منزل تو ختم ہو ہی گئی!
ایک موہوم راحتوں کی امید
تھک کے آغوشِ غم میں سو ہی گئی
ٹوٹ جائے گا یہ طلسمِ نظر
رنگ تاروں کا چھوٹ جائے گا
فرصتیں کم ہیں وقت بیتنے پر
کون آئے گا، کون جائے گا؟

سرِ رہگذارے

شبِ ماہ تو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے!

پندرہ اگست

یہی دن ہے جس کے لئے میں نے کاٹی ہیں آنکھوں میں راتیں
یہی سیلِ آبِ بقا، چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ؟
اسی کے لئے وہ سہانے مدھر رس بھرے گیت گائے تھے میں نے
یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چُور، بھرپور، مخمور ہے وہ؟

سُنا تھا نگاہوں پہ وہ قیدِ آدابِ محفل نہیں اب
وہ پابندیاں دیدۂ و دل پہ جو تھیں اُٹھی جا رہی ہیں
وہ مجبوریاں اُٹھ گئیں، ولولے راہ پانے لگے مسکرانے لگے اب
محبت کٹھن راستوں سے گذر کر لہکتی جھکتی ہوئی آرہی ہے!

وہی کسمپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیٔ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے.

شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے!

آزادی کے بعد

کہاں تو لہو تھا تصوّر ہی سے دل
مجھے ٹوٹنے والے تاروں کا غم تھا
کبھی نادمیدہ شگوفوں کا ماتم
کبھی سوختہ لالہ زاروں کا غم تھا
کبھی بانجھ دھرتی میں بوتا تھا آنسو
کبھی نافریدہ بہاروں کا غم تھا
کوئی جن کی بھینی مہک چھین لے گا
کبھی مجھ کو ان گل عذاروں کا غم تھا
ٹھہرتا جنازہ کہاں رنگ و بو کا
کبھی اپنے ہی غمگساروں کا غم تھا

کہاں نشترِ بادِ باراں سے ڈرتھا
کہ نورستہ پھولوں کو گھائل نہ کردے
کہاں بنیہ درگوشِ مبہوت، پتھر
قدم خونِ آغشتہ مٹی میں گاڑے
کھڑا دیکھتا ہوں وہ نورستہ پودے
وہ نا آفریدہ بہاریں، شگوفے
وہ مہکی ہوئی سی دلہن بوستاں کی
زمیں نے سنواری تھی جس کی جوانی
اسے اپنی آغوش میں لے رہی ہے
محبت کی ماری کفن دے رہی ہے

(۳)

نہیں فرصتِ یک نگہ آدمی کو
سیاست کے بوئے ہوئے بیج پھوٹے
بزرگوں کی بوئی ہوئی فصل پکّی
اشارے ملا اور "مزدور" چھوٹے
نہ اُجرت کی پروا، نہ خدشہ صلے کا
"درانتی" کی زد میں ہے ہر ایک پودا

زمیں اتنی زرخیز میدان شاداب!
یہاں بھی نہ پروان چڑھتا یہ پودا
یہاں بھی نہ پھلتے جو یہ بیج آخر
کہاں کی زمیں راس آتی انہیں پھر؟
شب و روز بس کھیتیاں کٹ رہی ہیں
کہ ڈھانچوں کے خوشوں سے بھرتی پٹی ہے
بجیں شادیانے، منیں رنگ رلیاں!

(۳)

اٹھو ساکنانِ تہِ ارضِ اسفل
ابھی تک نہ جانے ہو کس نشہ میں چور
سنو، آسماں بوس شہرت کے مینار
ہر اک قریہ و شہر ہے جن سے معمور
دلوں کی کثافت کو دھو ڈالتا ہے
جہاں سے سدا پھوٹ کر چشمۂ نور
تمہارے مرے رہنما اور خداوند
بلاتے ہیں ہم سب کو با چشمِ پُرنم

ہمارے سروں پر رہے ان کا سایہ
ہمیں اپنا ان کو نہ ماننے کا ہے غم
انہیں کے توسّل سے ہم سگ برادر
بھری بستیاں پارۂ استخواں پر
کھنڈر میں بدل ڈالنا سیکھتے ہیں
انہیں کا کرم ہے کہ ہم فتنہ پرور
ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے!

اٹھو ساکنانِ تہِ ارضِ اسفل
وہ شہرت کے مینار پھر جگمگائے
فضاؤں میں پاکیزہ آواز گونجی
ہمارے خداؤں کی، سر کو جھکائے
ہمیں کیا شجر اور حجر سن رہے ہیں
خداوند، مینار سے مسکرائے
اٹھو! اپنے چنگال و دنداں کو دیکھو
اگر اب نہ چمکے تو کس کام آئے!

(۴)

بہائم نے تہذیب کی کوستینیں!
جو لادے چلے آئے تھے پھینک دی ہیں
تمدّن یہ فرماں ہے جنگل کا نافذ
محبّت نے آنکھیں ابھی بند کی ہیں
ابھی نیند آئی ہے انسانیت کو

یہ کہگل جو اس خون مٹی سے مل کر
بنی، کس عمارت کی بنیاد ہوگی
وہ دھرتی جہاں آگ بوئی گئی ہے
ہوئی بھی تو کس طرح آباد ہوگی
یہ خونیں کہانی جو لکھی گئی ہے
مجھے یاد ہے کل کسے یاد ہوگی؟

(۵)

سوا نیزے پر آگیا آج سورج
لئے بائیں ہاتھوں میں اعمالنامے
گنہگار حیران و ششدر کھڑے ہیں
کہ اندھے ہیں سب کون گرتوں کو تھامے

عجب نفسی نفسی ہے پیشانیوں میں
ہیں پیوست آنکھیں، سب اپنے پرائے
اُجالے کی تاریکیوں سے ہیں نالاں
مگر کون کس کو غمِ دل سُنائے
اُبلتے ہیں سر، ہانڈیاں پک رہی ہیں

(۶)

سُنو! اے خداؤں کے محبوب بندو!
بہایا ہے جن کی محبت میں تم نے
لہو، جسم یوں کاٹ ڈالے کہ جیسے
کوئی سوکھے پیڑوں کے بَن کاٹ ڈالے!
وہ ناقوس اور گھنٹیاں مندروں کی
وہ مغموم اور دُکھ بھری داستانیں
تعاقب میں دوڑی چلی آرہی ہیں
فضاؤں میں تھرّا رہی ہیں اذانیں

(۷)

صنم ساز و اصنام روتے ہیں تم کو
یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو

تمہارے قلم نے رنگے ہیں، انہیں کیوں
ہمارے لئے چھوڑ کر جا رہے ہو ؟
یہ بارے گراں ساتھ لے جاؤ اپنے!

یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو
تمہارے قلم نے رنگے ہیں مسلسل
لہو بن کے تڑپیں گے ان کی رگوں میں
جو آئیں گی نسلیں، یہ بد ذائقہ پھل
جسے اتنی محنت سے بویا ہے تم نے
تمہارے جگر بند، اولاد ان کی
اور اولاد اُن کی کفن سر سے باندھے
مزاروں کے سایہ میں کھاتی رہے گی!

(۸)

مہک آئی آلودہ خوں پیرہن کی
مجھے اپنے دامن میں لے ماں! اندھیرا
میری سمت بڑھتا چلا آ رہا ہے
میرے بھائی جن پر بھروسہ کیا تھا

چھپائے ہوئے آستینوں میں خنجر
مجھے پیار سے لوریاں دے رہے ہیں

(۹)

گلوں سے الجھتی ہوئی شوخ کرنو!
نئے نرم پودوں کی معصوم روحو!
یہاں سے ذرا اور آہستہ گذرو
وہ درماندہ شاعر جسے آدمی نے
کئی بار چاہا کہ مایوس کردے
تمہارے لئے ہی جو تڑپا ہے برسوں
تمہاری اسی روز کی رہ گذر میں
اسی دامنِ خاک میں سو رہا ہے!

غلام رُوحوں کا کارواں

غلام روحوں کے کارواں ہیں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے!

اٹھو! تمدّن کے پاسبانو
تمہارے آقاؤں کی زمیں سے
ابل چکے زندگی کے چشمے،
نشان سجدوں کے اب جبیں سے
مٹاؤ۔ دیکھو چھپا نہ لے وہ
لہو ٹپکتا ہے آستیں سے!

غلام روحوں کے کارواں ہیں
نفس کی آواز بھی نہیں ہے!

اُٹھو، محبّت کے پاسبانو!
یہ کوہ و صحرا، یہ دشت و دریا
تمہارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں یہ وہ آتشیں ترانہ
جو گرمیِ بزم تھا مگر اب
گزر گیا اس کو اک زمانہ

سمندِ ایّام برق پا ہے
اُٹھو! کہ تاریخ ہر ورق پر
تمہارا شبھ نام ڈھونڈتی ہے
نہ دیں گے آواز اس کے شہپر
جو وقت اڑتا چلا گیا ہے
زمین آنکھوں سے مت کریدو
نہ مل سکیں گی وہ ہڈیاں جو

زمیں کا تاریک گہرا سینہ
نگل چکا ہے — نیا قرینہ
سکھاؤ پامال زندگی کو

اٹھو، مزاروں کے پاسبانو!
چلو نہ گرماؤ زندگی کو
یہ ڈھیر سونے پڑے ہیں ان پر
کہیں سے دو پھول ہی چڑھا دو!

پیمبرِ گل

فسانۂ گُلِ رنگیں قبا و نغمۂ شوق
طویل ڈھلتی ہوئی رات، انتظار کے گیت،
تڑپ کی آگ میں جلتے ہوئے زمان و مکاں
مئے نشاط میں بھٹکے ہوئے خمار کے گیت
مزہ نہ دیں گے ابھی ان کو احتیاط سے چھیڑ
خزاں نصیب ابھی تک ہیں کچھ بہار کے گیت

فسانۂ گُلِ رنگیں قبا و نغمۂ شوق
حکایتِ بتِ سیمیں عذار رہنے دے
نگاہ و دل پہ مرا اختیار رہنے دے

الم نصیب جنوں سو گیا نہ چھیڑ ابھی
نہ پا سکے گا جو ہیں کھو گیا، نہ چھیڑ ابھی

گذرنے والا ادھر سے ہے اک پیمبرِ گلُ
جلو میں اپنے لئے قافلے بہاروں کے
سکوں نواز حسیں گیت چاند تاروں کے
لطیف چھنتے ہوئے رنگ آبشاروں کے
نفس سے جس کے مہک جائیں گے خس و خاشاک
نگہ پہ بار نہ گذرے گا جلوۂ بےباک
زمیں کی شام کو ہم رنگِ صبح کر دے گا
بھکاریوں کی تہی جھولیوں کو بھر دے گا
اسی پیمبرِ گل کا ہے انتظار مجھے
نہ جانے کب سے سرِ راہگذر بیٹھا ہوں
برس گذر گئے امیدوار بیٹھا ہوں
وہ آئے گا ابھی اتنا ہے اعتبار مجھے

نگہ سے کھیلتی ہے مرگِ نغمہ ہائے شوق

خزاں کی یورشِ پیہم کا رنگ دیکھ چکا
زمیں پٹی ہوئی پھولوں کی زرد لاشوں سے
کہاں کہاں ہوئی گھائل اُمنگ دیکھ چکا
لئے لئے پھرا اک بار اپنے کاندھوں پہ
وبالِ دوش ہوا سر کہ سنگ دیکھ چکا

لہولہان امیدیں، جنوں کا دامن چاک
شریکِ حال کوئی تھا تو دیدۂ نمناک!

ستم زدوں کو نویدِ بہار دے گا کوئی
اس اعتبار پہ جینے کی آرزو بھی ہوئی
بگڑ چکے جو مقدّر سنوار دے گا کوئی
اک اس خیال سے اس دن کی جستجو بھی ہوئی
طلوع ہوگا کہیں سے جب آفتاب نیا
زمیں سے پھوٹ پڑیں گے شگوفہ ہائے رنگ
نئے نہال، نئی کونپلیں، نئے پھل پھول
نگارِ صبح کے ہنگامہ ہائے شوخ و شنگ
جو زیرِ خاک ہیں پودے انھیں جگائیں گے
یہ نرم ہاتھ جو نہی ان کو گدگدائیں گے

وہ آنکھ ملتے ہوئے لیں گے ایک انگڑائی
ہزار ناز سے پھر ایک سبز پیراہن
پہن کے نیست سے آئیں گے زندگی کی طرف
اندھیری گود سے معصوم روشنی کی طرف
یہ راگ بکھرے ہوئے دور تک فضاؤں میں
یہ گرد و پیش کہیں گھنگروؤں کی سی آواز
یہ رنگ سمٹے ہوئے زیرِ دامنِ گلِ نو
یہ رقص بھونروں کے ہر سمت، یہ چمن کا ساز
مہک اڑی ہوئی غنچوں کے نرم ہونٹوں سے
گلوں کے چھلکے ہوئے جام کا لطیف خمار
سمیٹتا ہوں انہیں اپنے تنگ دامن میں
کہ دینے آئے گا جس وقت وہ پیامِ بہار
لٹاؤں گا انہیں اس وقت اس کے قدموں پر

سجائے ہیں در و دیوار وہ خدائے جمال،
جو آ گیا مرے ظلمت کدے میں کیا ہوگا
سیاہ خانہ کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا
سجائے ہیں در و دیوار بہر استقبال

یوں نہ کہو

کبھی نہ اس کے بھاگ کھُلیں گے پیاسی مٹی رہے گی پیاسی
یوں نہ کہو مرجھائے پودے یوں ہی سدا مرجھائے رہیں گے
چلتے چلتے اس منزل پر آکر دھرتی رک جائے گی
یوں نہ کہو گہنائے سُورج، یونہی سدا گہنائے رہیں گے
تم تو شفق کے کھلتے ملتے رنگوں کی اک گلکاری ہو
تم تو سحر کا ہلکا ہلکا نور ہو جس سے دُنیا جاگے
تم تو مہک ہو کھلتے پھول کی چڑھتے دن کا اُجلا پن ہو
تم نے تو سلجھائے ہیں آکر ذہن کے کتنے اُلجھے دھاگے
تم کو ہم نے اپنا کہا ہے تم تو یوں نہ کہو، زنداں کے
کبھی نہ بھاری قفل کھلیں گے، کبھی نہ زنجیریں ٹوٹیں گی!

جنگ

(۱)

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگِ آہن سے لہو
سنگ پاروں سے ابلتی ہوئی دیکھی ہے شراب
میں نے دیکھا ہے سرِ شاخ یہ ہنگامِ بہار
آتشِ گل سے جھلستے ہوئے خود برگِ گلاب
میں بھی اس بھیڑ میں تھا جو سرِ مقتل آئی،
پا بدستے دگرے دست بدستے دگرے
مرگِ انبوہ میں بھی جشن کا ساماں نہ تھا
کوئی ایسا نہ تھا جو جامِ مئے تند بھرے
سر بہ زانو تھا کوئی، خاک بسر تھا کوئی
محفلِ زیست میں بجھتا سا شرر تھا کوئی

وسطِ مشرق کی یہ خندق تھا مقدّر جن کا

اُن میں سے ایک نے اک روز کہا تھا مجھ سے
میں نے باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ وفا
ان گھنی پلکوں میں وہ پیار سے بھرپور آنکھیں
ڈبڈبا آئیں، چھلک اُٹھیں، ستارے ٹوٹے
میں جو رخصت ہوا، جلتے ہوئے رخسار پہ
چھا گیا شام کا رنگ اور سہارے ٹوٹے
اس کے ہونٹوں پہ کوئی بات تھی میں سن نہ سکا
میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں روک نہ لے
کیا خبر تھی ہو اک موت کا جھونکا آیا
ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سُنے
کون اس سوختہ جاں سوختہ تن کا چھوڑو
بھاگ کر چھپ گئے ہم اپنی کمیں گاہوں میں
کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں،
دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے جانے کب سے

میں نے سوچا کبھی مل جائے کہوں گا اس سے

حاکمِ وقت کا منشا تھا محبّت کی جگہ
اس کو نفرت ملے، نفرت ہی ابھی لطفِ خرام
جس جگہ جاؤ وہاں شرق میں بھی غرب میں بھی
وسطِ مشرق کی زمیں نے تجھے بھیجا ہے سلام!

(۲)

دہقاں سنوارتا ہے مٹی
چُن چُن کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے؟
اور دل کو ٹٹولتا ہے رک کر
پھر دُور افق کو دیکھتا ہے
کچھ رنگ سے تیرگی میں ڈوبے
مجبُور اُفق کو دیکھتا ہے

آنکھوں میں لہو کی بوند کانپی
گرتے ہی زمیں پہ کھو گئی پھر
پروان چڑھائے تھے جو پودے
وہ جل گئے رات ہو گئی پھر
خالی کئی گوشے ہو گئے ہیں
تنہا تو نہ تھا، پہ رہ گیا ہے
کرنا پڑا ابتِشِ غم گوارا
کِس کِس کا نہ خون بہہ گیا ہے

پھر دُور افق کو دیکھتا ہے
یہ کھیت، یہ وسعتِ بیاباں
سرسبز زمین کے یہ پھل پھول
یہ سبزۂ تازہ، یہ خیاباں
سب آگ میں جل رہے ہیں گویا
تھم تھم کے پگھل رہے ہیں گویا

دہقان سنوارتا ہے مٹّی
رُک رُک کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے؟

۳

ہم نے اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ دیا
ارضِ مغرب ہی آغوش تھی شاید اس کو
بھینچ لے پیار سے اور لوریاں دے دے کے کہے
"میں زمیں ہوں، مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!
میں یہ تفریق نہ کر پاؤں گی کس مٹی نے
تم کو پالا، تمہیں پروان چڑھایا تھا کبھی
یہ خط و خال ہیں کس گود کے پروردہ تمہیں
کس نگہِ سوز نے محبوب بنایا تھا کبھی
میری اولاد ہو تم شرق میں بھی غرب میں بھی
میں زمیں ہوں مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو

میرے دریا مرے پھل پھول مرا سبزۂ شوخ
سب تمہارے لئے ہیں چھین جھپٹ ہی پھر کیوں؟
تم مرے لطف و محبت کے نگہبان ہو سب
آپ ہی آپ مگر لاگ لپیٹ ہے پھر کیوں؟

اتنی دُور آئے تھے کیوں موت اگر پیاری تھی؟
تم نہ کچھ اپنے ہی کام آئے نہ غیروں ہی کے کام
جن پہ تم جھپٹے تھے وہ بھی تو کوئی غیر نہیں
رشتۂ خوں ہے وہی صرف ہیں بدلے ہوئے نام
تم تھکے ہارے ہو گم کردہ رہ ہو سو جاؤ!
صبح ہو جائے گی تاریکیٔ شب میں کھو جاؤ!

مجھ سے یوں چھوٹ گیا میرا وہ برسوں کا رفیق
گویا مٹی کا کھلونا تھا کہ توڑا پھینکا
ہم بھی اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ گئے
موت نے زیست کو جیسے جھنجھوڑا پھینکا

اک گھنے پیڑ کی پھیلی ہوئی بوجھل شاخیں
ٹوٹ کر گرنے لگیں شعلۂ جوالہ اٹھا
پنبئی پھول، ہری ڈالیاں پھولوں سے لدی
سب ہی کچھ جلنے لگا جل کے یونہی خاک ہوا

اندوختہ

گہرا نیلا، بسیط و بلند آسمان
اتنا خاموش، ٹھہرا ہوا، پُر سکوں
اس طرح دیکھتا ہے مجھے جیسے میں
اپنے گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ ہوں
تم کہاں ہو مری رُوح کی روشنی
تم تو کہتی تھیں یہ درد پائندہ ہے
تم کہاں ہو بہشتِ نگہ جانِ من ؟
تم سے اب تک مری داستاں زندہ ہے
تم کہاں ہو ؟ میرے راستوں کے دیے

بجھ گئے، پھر بھی ہر چیز تابندہ ہے
ملوں کارخانوں کے بوجھل دھوئیں
قحبہ خانوں کی مغموم تابندگی
کاہنوں کی محبت کا فضلہ جسے
ربّ موجود و معدوم نے بخش دی
دائمی زندگی، میں تمہارے لئے
عہدِ قارون کی گیر اور دار سے
اپنی زخمی محبت بچا لایا ہوں

سلسلے

شہر در شہر، قریہ در قریہ
سالہا سال سے بھٹکتا ہوں
بارہا یوں ہوا کہ یہ دنیا
مجھ کو ایسی دکھائی دی جیسے
صبح کی ضو سے پھول کھلتا ہو
بارہا یہ ہوا کہ روشن چاند
یوں لگا جیسے ایک اندھا کنواں
یا کوئی گہرا زخم رستا ہوا
میں بہر کیف پھر بھی زندہ ہوں
اور کل سوچتا رہا پہروں
مجھ کو ایسی کبھی لگن تو نہ تھی
ہر جگہ تیری یاد کیوں آئی ؟

محبّت

رات میں دیر تک اڑتے بادل کھلے چاند کی کشمکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھا کیا جیسے یہ ماجرا
میری ہی داستاں کا کوئی پارہ ہے، کون آوارہ ہے
تو کہ میں؟ ایک چھوٹا سا طائر فضا میں تھا تمنہ سرا
دُور نزدیک پھر دور ہر سمت اک تان کی گونج تھی
رات آہستہ آہستہ رُک رُک کے ایسے گذرتی رہی!
جیسے میں اور تُو وقت کی زاویوں سے گذرتے ہوئے
شہر کی سونی، سنسان، خاموش گلیوں میں گم ہو گئے
رات کی کالی دھاری سے دن کی سپیدی الگ ہو گئی
دونوں اک دوسرے سے الگ ہو گئے، ہاں وہ طائر مگر
یوں ہی گاتا رہا، اڑتے بادل کھلی چاندنی کا سماں

وقت کے ساتھ ساتھ آپ تبدیل تحلیل ہوتا رہا
میں تجھے تو مجھے ڈھونڈتی رہ گئی، وقت اڑتا گیا
ان خنک سانولی بھیگی راتوں کی پُرشوق تنہائیاں
صرف اک داغِ غم تاب کی شکل میں منجمد ہو گئیں
پر وہ نغمہ، وہ حسنِ زمین و زماں، روشنی
اس پرندہ کی وہ دھیمی آواز اور میٹھی کلکاریاں
بزنتِ آغاز و انجام کے باکرہ بطن میں رہ گئیں!
اور اک نسل سے دوسری نسل تک عکسِ رُوحِ ازل
عکسِ روحِ ابد ایسے نشو و نما پائے گا خون میں
جیسے بنجر زمیں قطرۂ ابر سے سبز و شاداب ہو
اڑتے بادل کھلی چاندنی کا سماں، میٹھی تنہائیاں
سب کی سب بن کے مٹتی ہوئی پیاری تصویریں ہیں
صرف تبدیل ہوتی ہوئی روشنی کی جھلک زندہ ہے
صرف حسنِ ازل اور حسنِ ابد کی مہک زندہ ہے
صرف اس طائرِ خوش ادا خوش نوا کی لہک زندہ ہے
ایک دن آئے گا تُو بھی مر جائے گی، میں بھی مر جاؤں گا!

تاریک سیارے کے بعد

وہ مکان

سنگ و خشت و آہن سے
میں نے اپنی امیدیں
ایسے باندھ لیں جیسے
سنگ و خشت و آہن میں
رابطہ ہوں میں کوئی

ایستادہ رہتا ہوں
اس مکان کے نیچے
تاکہ وہ پری پیکر
رات کے کسی لمحے
خواب سے اگر چونکے
دیکھ لے مجھے اک بار

یہ دفائے مرگ آثار
میرے دم سے زندہ ہے

ایسی مُردہ ساعت میں
جاگتے ہیں ہم دو ہی
ایک میں ہوں اور اک وہ
کارخانے کی چمنی
جو ہے ایک مُنعم کی
ذاتی ملکیت اب بھی!

لمحہ لمحہ کم ہو کر
رات کٹتی جاتی ہے
جو نفس گزرتا ہے
عمر گھٹتی جاتی ہے
اور اپنے امکاں میں
اس قدر نہیں مُنہ کو
زخم کی طرح سی لیں
اس قدر نہیں غم کو
زہر کی طرح پی لیں
اس قدر نہیں ان سے
دُور رہ کے بھی جی لیں!

انتظار

زندگی اک طویل بل کھاتی
شاہراہِ عظیم ہے جس پر
نرم مٹّی کی گود کے پالے
کتنے بھرپور سایہ دار شجر
کتنی سرشور ندّیاں، چشمے
کتنے ماہ و نجوم، آوارہ
مشعلیں اپنی نیر گی میں لیے
کتنی خوشبوئیں ناگ رنگ کے پھول
منتظر راہ رو کی آمد کے
صبح سے شام تک سنورتے ہیں
روز و شب انتظار کرتے ہیں!

ترکِ وفا

سرما کی اُداس چاندنی کا
شاید تمہیں یاد ہو وہ ہنگام
جب عہد کیا تھا میں نے تم سے
چاہے مری زندگی کے ایام
عسرت میں کٹیں کہ زرگری میں
لیکن میں بگولہ سا کسی دن
آؤں گا تمہاری آرزو میں
یا شکوۂ جورِ دہر کرنے
اشکوں کا خلوص آزمانے
یا دینے مسرتوں کا پیغام
اور اپنی وفا کی داد پانے

گر اور کسی کی ہو گئیں تم
جینے دوں گا نہ میں جیوں گا
تم کو بھی پلاؤں گا وہی میں
"جو زہرِ حیات خود پیوں گا"
میں آج وہ عہد توڑتا ہوں
یہ رسمِ وفا ہی چھوڑتا ہوں!

بُلاوا

نگر نگر کے دیس دیس کے، پربت ٹیلے اور بیاباں!
ڈھونڈ رہے ہیں اب تک مجھ کو، کھیل رہے ہیں میرے ارماں
میرے سپنے میرے آنسو، ان کی چھلنی چھاؤں میں جیسے
دھول میں بیٹھے کھیل رہے ہوں بالک باپ سے روٹھے روٹھے!

دن کے اُجالے، سانجھ کی لالی، رات کے اندھیارے سے کوئی
مجھ کو آوازیں دیتا ہے، آؤ آؤ، آؤ آؤ!
میری رُوح کی جوالا مجھ کو پھونک رہی ہے دھیرے دھیرے
میری آگ بھڑک اٹھی ہے، کوئی بجھاؤ، کوئی بجھاؤ

میں بھٹکا بھٹکا پھرتا ہوں کھوج میں تیری جس نے مجھ کو

کتنی بار پکارا لیکن ڈھونڈ نہ پایا اب تک تجھ کو
میرے سنگی میرے ساتھی تیرے کارن چھوٹ گئے ہیں
تیرے کارن جگ سے میرے کتنے ناتے ٹوٹ گئے ہیں!

میں ہوں ایسا پات ہوا میں پیڑ سے جو ٹوٹے اور سوچے
دھرتی میری گور ہے یا گھر، یہ نیلا آکاش جو سر پہ
پھیلا پھیلا ہے، اور اس کے سورج چاند ستارے مل کر
میرا دیپ جلا بھی دیں گے، یا سب کے سب روپ دکھا کر
ایک اک کر کے کھو جائیں گے، جیسے میرے آنسو اکثر
پلکوں پر تھرّا تھرّا کر تاریکی میں کھو جاتے ہیں
جیسے بالک مانگ کر نئے کھلونے سو جاتے ہیں

چلو کہ آج

کوئی جو رہتا ہے رہنے دو مصلحت کا شکار
چلو کہ جشنِ بہاراں منائیں گے سب یار
چلو نکھاریں گے اپنے لہو سے عارضِ گل
یہی ہے رسمِ وفا اور من چلوں کا شعار
جو زندگی میں ہے وہ زہر ہم ہی پی ڈالیں
چلو ہٹائیں گے پلکوں سے راستوں کے خار
یہاں تو سب ہی ستم دیدہ غم گزیدہ ہیں
کرے گا کون بھلا زخمہائے دل کا شمار
چلو کہ آج رکھی جائے گی نہادِ چمن
چلو کہ آج بہت دوست آئیں گے سرِ دار!

شفقتی

رنگوں کا چشمہ سا پھوٹا ماضی کے اندھے غاروں سے
سرگوشی کے گھنگھرو کھنکے گرد و پیش کی دیواروں سے
یادوں کے بوجھل پردے اُٹھے، کانوں میں جانی انجانی
لوچ بھری آوازیں آئیں جیسے کوئی ایک کہانی
دُور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا پودوں سے کہتا ہو
جیسے جھرنا قطرہ قطرہ رِس رِس کر بہتا رہتا ہو
مُدّت بیتی اِن باتوں کو مضطر آج تلک کہتا ہے
دشتِ ہویدا کا دیوانہ تند بگولوں سے کہتا ہے
آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے دُکھ سے چُور مری نس نس ہے
ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو ایک دفعہ کی اور ہوس ہے!

شکستِ خواب

کون ہو بنتِ مہ و مہرِ درخشاں و نجوم
کس لئے آئی ہو غم خانہ منوّر کرنے؟

منتظر میں بھی تھا برسوں سے کوئی سیم بدن
نرم مخمل کی طرح، پھول سی، ہلکی، ہمہ نور
یوں بڑھے میری طرف جیسے ندی کی لہریں
رات بھر ناچنے والی کی طرح نیند سے چُور
ہاتھ پھیلائے کنارے کی طرف بڑھتی ہیں
یوں بڑھے میری طرف جیسے کہیں شہر سے دُور
رات کے بطن میں سوئی ہوئی آسودہ کرن

سبزۂ خاک بداماں کی طرف بڑھتی ہے
اور اک آن میں ڈھل جاتے ہیں سب رنج و محن

کون ہو بنتِ مہ و مہرِ درخشان و نجوم
کس لیے آئی ہو غم خانہ منوّر کرنے ؟

اس کے ہر گوشہ کو مہکا دو بنا دو فردوس
تم اسے اپنی محبّت سے فروزاں کر دو
بیت کی کرسی، کتابیں، وہ پُرانے جوتے
جھاڑ کر ان کو ذرا گھر میں چراغاں کر دو!

آخرِ شب

ڈھلی رات تارے جھپکنے لگے آنکھ شبنم کے ناسفتہ موتی
سرِ شاخِ گل اپنے انجام سے کانپ اٹھے خواب پُورے ادھورے
اُڑے جیسے اُودے، روپہلی، سنہرے، سیہ، ملگجے، بھورے بادل
تہہِ آسماں روئی کے نرم گالوں کی مانند ہر سمت اڑتے
بکھرتے، اور ندامت کی ضرب کو بھول کر پل گذرتے گذرتے
سرِ بالشِ خاک سب ضدّی بچوں کی مانند روتے، مچلتے
چڑھتی نیند سے چُور ہو کر وہیں سو رہیں، یاد کی سبز پریاں!
گھنے جنگلوں، لالہ زاروں، پہاڑوں، بھری وادیوں سے گزرتی
کہیں تاقِ ماضی کے نمناک غاروں میں روپوش ہونے لگیں ہیں

مبارک ہو میں نے سنا ہے کہ تم پھول سی جان کی ماں بنی ہو
مبارک سنا ہے تمہارا ہر اک زخم اب مندمل ہو گیا ہے!

اشعار

ابھی گلال ہوں عارض، عرق عرق ہو جبیں
ذرا جو کہہ دوں نہیں تم سے بڑھ کے کوئی حسیں

بُتانِ خلد تصوّر کا ذکر کرتا ہوں
تمہارے قامت و رخسار و لب کی بات نہیں

تمہارے نام سے باغ و بہار ہے دُنیا
تمہاری چاہ سے لگتا ہے جی کو رو گ نہیں

اب آگے دیکھیئے کیا ہو مآلِ اُلفت کا
قبائے گل تو بنا دی ہے عاشقوں نے زمیں

آخری ملاقات

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

آتی نہیں کہیں سے دلِ زندہ کی صدا
سونے پڑے ہیں کوچہ و بازارِ عشق کے
ہے شمعِ انجمن کا نیا حسنِ جاں گداز
شاید نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے
تازہ نہ رہ سکیں گی روایاتِ دشت و در
وہ فتنہ سر گئے جنہیں کانٹے عزیز تھے

اب کچھ نہیں تو نیند سے آنکھیں جلائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی اب کبھی
اک بار پھر ملے ہیں ذرا مسکرا تو لیں!
کیا جانے اب نہ الفتِ دیرینہ یاد آئے
اس حسنِ اختیار پہ آنکھیں جھکا تو لیں!
برسا لبوں سے پھول، تری عمر ہو دراز
سنبھلے ہوئے تو ہیں پہ ذرا ڈگمگا تو لیں!

اور اپنا اپنا عہدِ وفا بھول جائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

برسوں کی بات ہے کہ مرے جی میں آئی تھی
میں سوچتا تھا تجھ سے کہوں، چھوڑ کیا کہوں!
اب کون ان شکستہ مزاروں کی بات لائے
ماضی پہ اپنے حال کو ترجیح کیوں نہ دوں!
ماتم خزاں کا ہو کہ بہاروں کا، ایک ہے
شاید نہ پھر ملے تری آنکھوں کا یہ فسوں!

جو شمعِ انتظار جلی تھی بجھائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

رخصت

فضائیں نم، گرد و پیش بوجھل، زمین پاؤں تلے ہے دلدل
نہ جاؤ! ہر اشک کہہ رہا ہے، لبوں پہ وعدے مچل رہے ہیں
ہر ایک شاخِ نہالِ امید کا ہے نغمہ گلو گرفتہ
خوشی کی شاداب و سبز وادی سے شور چشمے اُبل رہے ہیں
مرے لئے تند ہے یہ صہبا، یہ مے ترے گرم آنسوؤں کی
پگھلنے والا ہے ظرف میرا، مگر ترے جام ڈھل رہے ہیں
ابھی سے یوں مضمحل نہ ہو تو، بگولہ خو ہوں ابھی تو... بس بھی
ابھی تو گردش میں ہے زمانہ، ابھی تو تارے چل رہے ہیں
ترے لئے سنگ ہی سہی ہیں، بجھے نہیں ہیں مرے شرارے
ترے لئے برف ہی سہی ہیں، مگر مرے داغ جل رہے ہیں

ترغیب اور اس کے بعد

ترغیب :-

پھر میں کام میں لگ جاؤں گا آ فرصت ہے پیار کریں
ناگن سی بل کھاتی اٹھ، اور میری گود میں آن مچل
بھیا بھاؤ کی بستی میں کوئی بھید بھاؤ کا نام نہ لے
ہستی پر یوں چھا جا بڑھ کر، شرمندہ ہو جائے اجل
چھوڑ یہ لاج کا گھونگھٹ کب تک رہے گا ان آنکھوں کے ساتھ
چڑھتی رات ہے ڈھلتا سورج گھڑی گھڑی مت پاؤں مل
پھر یہ جادو سو جائے گا سمے جو بیتا گہری نیند
جو کچھ ہے انمول ہے اب تک ایک اک لمحہ ایک اک پل
بن چھوئی مٹی کی خوشبو اس کا سوندھا سوندھا پن
سب کچھ چھن جائے گا اک دن، اب بھی وقت ہے دیکھ سنبھل

نرم رگوں میں میٹھی میٹھی ٹیس جو یہ اُٹھتی ہے آج
چڑھتی موج کا ریلا ہے اک ٹیس نہ یہ اُٹھے گی کل!
مست رسیلی آنکھوں سے یہ چھلکی چھلکی سی اک شے
جس نے آج اپنایا اس کو سمجھو اس کے کار سپھل
میں تیرے شعلوں سے کھیلوں تو بھی میری آگ سے کھیل
میں بھی تیری نیند چراؤں، تو بھی میری نیندیں چھل
نرم ہوا کے جھونکوں ہی سے کھلتی ہے پھولوں کی آنکھ
ورنہ برسوں ساتھ رہے ہیں ٹھہرا پانی بند کنول!

اس کے بعد :-

بھیگی رات کا نشہ ٹوٹا، ڈوب گیا ہے چڑھتا چاند
تھکے تھکے ہیں اعضا سارے اور ہوئیں پلکیں بوجھل
شبنم کا رس پی گئیں کرنیں، دن کا رنگ چمک اٹھا
گونج ہے بھنوروں کی کانوں میں پر ہیں آنکھوں سے اوجھل
حسن اور عشق کی اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ دیا
میں اپنے رستے جاتا ہوں اور تو اپنی ڈگر پر چل!

میں اور تُو

نالۂ نیم شب کی طرح میں اگر یوں نہ بے چین، برباد رہتا
بادِ پا بادلوں کی طرح میں اگر یوں نہ آوارہ پھرتا
آندھیوں اور بگولوں کی مانند میں گر نہ دردر کی یوں خاک اُڑاتا
اور سرشور چشموں کے مانند یوں جا چٹانوں سے ٹکراتا گرتا
مجھ میں یہ زندگی کی لگن، یہ حرارت، تڑپ، جو کبھی تم دیکھتی ہو
اس وجود و عدم کے خلا میں کہیں برف کی طرح رہ جاتی گل کر
ان فضاؤں میں تحلیل ہو کر مجھے اور تجھے بھول چکتی ستم گر!

رزم

ایک آواز کے ساتھ اٹھیں نگاہیں سب کی
جھک گئیں اُٹھتے ہی، کچھ رنگ فضا میں ناچے
شور سا اُٹھا، "بہار آئی لہو سے کھیلو"
خار و خس جامۂ گل رنگ پہن کر جاگے!

خون پروردہ بہار آئی شہیدوں کیلئے
سبزہ و گل کا کفن پہنے مگر پا نہ سکی
استخواں ہائے شکستہ بھی شہیدوں کے کہیں
ایک نغمہ بھی سرِ محفل نَو، گا نہ سکی!

ایک آواز کے ساتھ اٹھیں نگاہیں سب کی
جھک گئیں اُٹھتے ہی، آباد تھا اک ہو کا دیار
گرم رفتار تھے ہر سمت بگولے جس میں
رقص کرتی ہوئی پھرتی تھی خزاں غم بکنار

قافلہ

یہاں سے دُور نہیں خیمۂ نگارِ سحر
قدم بڑھاؤ چپ و راست ہے گراں خوابی!

وہ مَن چلے یہ زمیں جن کے دم سے زندہ ہے
وہ جن کا خون شفق، سرخیِٔ گلِ تازہ
سمن بَروں کی حنا غازۂ لب و عارض
بگولہ پا، شرر آسا، سپہر اندازہ
کمند ڈالنے والے مہِ درخشاں پر
تم اُن کے قصوں کی چھاؤں میں پرورش پا کر
جواں ہوئے ہو خراماں سہی بڑھے جاؤ
یہاں سے دُور نہیں خیمۂ نگارِ سحر!

طویل راہ کٹے اور سفر نہ ہو معلوم
کچھ اُن کے جور و تغافل کا ذکر کرتے چلو
زبان و دل پہ ہیں پہرے بھی' بھول جاؤ یہ بات
بلا کشو خمِ کاکل کا ذکر کرتے چلو

مہک رہی ہے شبِ نیم جاں تصور سے
اُسی گلاب دہن' سادہ لوح ساحر کے
وہی ہے قامتِ موزوں وہی ہے سادہ لباس
وہی بھلا سا تبسم جو زندگی کی اساس!
وہی حلاوتِ گفتار' بات میں ٹھہراؤ
وہی نظر کا چرانا' وہی ہے نرم سبھاؤ
وہی ہے زخموں پہ مرہم لگانے کا انداز
وہی کھنکتی ہوئی کچھ دبی دبی آواز
وہی مزاج میں وارفتگی' یہ جب دیکھا
ہمیشہ میں یہی سمجھا کہ پی رہے ہیں شراب
اس احتیاط نے رسوا کیا انہیں بھی بہت
اس التزام نے مجھ کو بھی کر دیا تھا خراب

دہن دریدہ سگ و دشمنِ سحر خفاش
شغال و گرگ، نہنگ و پلنگ، اژدر و مار
کمیں گاہوں میں بیٹھے ہیں منہ چھپائے ہوئے
یہ دیکھنا ہے کہ کرتا ہے کون کس کو شکار؟
قدم بڑھاؤ چپ و راست ہے گراں خوابی
دبے دبے چلیں، کچھ تھوڑی احتیاط کریں
یہاں سے دُور نہیں خیمۂ نگارِ سحر
مگر یہ خامشی کیوں، اور کوئی بات کریں
تلاشِ زیست میں نکلے ہیں مرگ میں تو نہیں
گراں ہے ظلمتِ شب اپنی باری بھریں

سناؤ کوئی کسی رشکِ لالہ کی رُو داد
خموشی جس کی شکر گفتگو ہو قند و نبات
کسی شرارہ صفت خوبرو کی چشمِ کرم
ہوئی تو کیسے چلی کیسے ننگ و نام کی بات
لگی تو کیسے لگی ٹھیس آبگینوں کو
کھنک جو پیدا ہوئی کیا ہوا مآلِ حیات

خرامِ بادِ بہاری کا ذکر چھیڑیں کچھ
کہ اس سے ملتا ہو شاید کسی حسیں کا خرام
شمیمِ مشک فشاں ہو نہ گیسوؤں کی مہک
جو معجزہ ہے مسیحا کا ہو نہ اس کا کلام

سناؤ کوئی کسی شعلہ خُو کا افسانہ
متاعِ دل کو سمجھتا رہا جو ہیزمِ دل
وہ ایک زود پشیماں جو آتشِ گل سے
جلا کیا نہ ہوا مرگِ عاشقاں پہ خجل
وہ جس کی چینِ جبیں ہو نظر کا نذرانہ

گراں ہے ظلمتِ شب وقت کاٹنے کیلئے
کبھی خوشی کی کبھی غم کی کوئی بات سنائیں
بُرے بھلے یہی سب لوگ اپنی دنیا ہیں
نقیبِ صبحِ بہاراں انہیں کی خیر منائیں
انہیں کو ساتھ لیے ان کے ساتھ بڑھتے چلیں
انہیں سے رونقِ بزمِ جہاں کا امکاں ہے!

سنہ ۱۹۵۳ء

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عُریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم، تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں، کبھی جیوں چشم خوں بستہ

ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد، سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عزّ و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کمخواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایا
اسی کی بخششیں ہیں اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے، خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی، مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی

سمندر موتیوں مونگوں سے کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اُجالے سے جدا کرتا ہے خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اُسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو ؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جُز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے

وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکہ کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم!
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں!

دسمبر سنہ ۵۴ء

ان سے اندازۂ بہار نہ کر!

ان سے اندازۂ بہار نہ کر!

یہ شگفتہ گلوں کی طرح حسیں
اُجلے اُجلے سفید پوش جواں
چشمِ غمّازہ، رَت جگے، چنچلیں
ابروؤں کی کھنچی ہوئی سی کماں
تتلیاں، پھول، بھونرے رازونیاز
اپنی دنیا میں ایسے کھیل کہاں؟

یہ ہیں افراد اس جماعت کے
بن کو زخموں سے چور، سینہ فگار
آدمیت کا نالۂ دلدوز
جن کو محسوس زندگی کی پکار

ایسا نغمہ سنائی دیتی ہے
ہو جو فردوسِ گوشِ روحِ بہار!

خامہ سوزی ہے جیسے میرا شعار
ایسے ان کا ہے زر کا استحصال
جیسے میں جمع کرتا ہوں آنسو
ایسے یہ جمع کرتے ہیں زر و مال
قحط، ہنگامے، حادثات، وبائیں
ابتری خانہ جنگیاں، فتنے
ان کو اس طرح راس آتے ہیں
جیسے کووں کو ڈھیر کوڑے کے

یہ شگفتہ گلوں کی طرح حسیں
اُجلے اُجلے سفید پوش جو ان
چشمِ غمّاز، رت جگے، چہلیں!
ابروؤں کی کھنچی ہوئی سی کماں
تتلیاں، پھول، بھونرے، راز و نیاز
اپنی دنیا میں ایسے کھیل کہاں؟

ان سے اندازہ بہار نہ کر!

تماشا

جشنِ نوروز ہے سجے کوچے
نُور سے شہر جگمگاتا ہے
اک سمندر کی موج ہے کہ ہجوم
یا بھرا کھیت لہلہاتا ہے
اک طرف خوش خرام یوں ہیں حسیں
تندیٔ مے کا لطف آتا ہے
اک طرف لڑکھڑاتا نشّے میں
میگساروں کا خیل جاتا ہے
بادہ نوشی ہزار بند ہوئی
محتسب کیا کسی کا داتا ہے
اک صدا گونجتی ہے گلیوں میں
پینے والو! خدا پلاتا ہے

ہر بدرؔرو ذخیرہ گاہ بنی
ہر طرف ساقیوں کا تانتا ہے
اب مئے خانہ ساز کا ہے دَور
کون باہر کی منہ لگاتا ہے
رسمِ جامِ سفال عام ہوئی
خوں شہیدوں کا رنگ لاتا ہے
شورہ پشتوں کی آج بن آئی
ہر نجیب اُن کے ناز اٹھاتا ہے
مصلحِ وقت کی سیاست سے
ہر کفن چور گیت گاتا ہے
کوچہ گردوں نے راہ روکی ہے
کوتوال ان سے مُنہ چراتا ہے
لوگ کہتے ہیں ساز باز ہے کچھ
غیب کا علم کس کو آتا ہے ؟

اس تماشے کے پیچھے بیٹھا کون
دلربائی سے مسکراتا ہے ؟

اکتو

آگہی

میں جب طفلِ مکتب تھا ہر بات ہر فلسفہ جانتا تھا
کھڑے ہو کے منبر پہ پہروں سلاطینِ پارین و حاضر
حکایاتِ شیرین و تلخ ان کی، ان کے درخشاں جرائم
جو صفحاتِ تاریخ پر کارنامے ہیں، اُن کے اوامر
نواہی، حکیموں کے اقوال، دانا خطیبوں کے خطبے!
جنہیں مستمندوں نے باقی رکھا، اس کا مخفی و ظاہر
فنونِ لطیفہ، خداوند کے حکم نامے، فرامیں
جنہیں مسخ کرتے رہے پیرزادے جہاں کے عناصر

ہر اک سخت موضوع پر اس طرح بولتا تھا کہ مجھکو
سمندر سمجھتے تھے سب علم و فن کا ہر اک میری خاطر
تگ و دو میں رہتا تھا۔ لیکن یکایک ہوا کیا یہ مجھ کو
یہ محسوس ہوتا ہے سوتے سے اٹھا ہوں، ہلنے سے قاصر
کسی بحر کے سونے ساحل پہ بیٹھا ہوں گردن جھکائے
سرِ شام آئی ہے دیکھو تو ہے آگہی کتنی شاطر!

فروری

یادیں

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رُکتے رُکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو، گزری بات ہے نقش بر آب
یہ روداد ہے اپنے سفر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

شہرِ تمنا کے مرکز میں، لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سو ہے اک رنگیں گلزار کھلا

وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی انگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا
بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

وہ بالک ہے آج بھی حیراں، میلا جُوں کا تُوں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں، ورنہ رُوح بن نہر آگیں
گھسے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا جھکی ہے اکثر وہی جبیں

کبھی کوئی سفلہ ہے آقا، کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

کالے کوس غمِ اُلفت کے اور میں نانِ شبینہ جُو
کبھی چمن زاروں میں اُلجھا اور کبھی گندم کی بُو
نافۂ مشکِ تتاری بن کر لئے پھری مجھ کو ہر سُو
یہی حیاتِ صاعقہ فطرت بنی تعطّل کبھی نُمو
کبھی کیا رم عشق سے ایسے جیسے کوئی وحشی آہُو
اور کبھی مرمر کے سحر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

کبھی غنیمِ جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارضِ الم میں خوار ہوئے ہم، بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جُگ، ہوئی نہ رات
ہر سو ہوشِ سادہ، قائل لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں، پھولوں کی مہکار سی بات

جُوں تُوں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

راہ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار ملے
ابرِ بہاراں عکسِ نگاراں خالِ رُخِ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو، کچھ خنجر کی دھار ملے
کچھ منجدھار میں، کچھ ساحل پر، کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یونہی ہاتھ پسار ملے
صرف اُن کی خوبی پہ نظر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے جب تھی پل بھر کی دوری بھی شاق
کہیں کوئی ناسور نہیں گو حائل ہے برسوں کا فراق
کرمِ فراموشی نے دیکھو، چاٹ لئے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں، چلو ہوا قرضہ بیباق

کھلی تو آخر بات اثر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

خواب تھے اک دن اوجِ زمیں سے کاہکشاں کو چھو لیں گے
کھیلیں گے گل رنگ شفق سے قوسِ قزح میں جھولیں گے
بادِ بہاری بن کے چلیں گے سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگین جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغِ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوشبو لیں گے
ملی خلش پر زخمِ جگر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

خوار ہوئے دمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اٹھے جیسے چھوا تو کر دے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی، ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر، کبھی قلندر، کبھی بگولہ، کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گذر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

زیست خدا جانے ہے کیا شے، بھوک تجسّس، اشک، فرار
پھول سے بچے، زہرہ جبینیں، مرد مجسّم باغ و بہار
مُرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں؟ کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے رُوحِ ارض کو آخر؟ اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اُگتے ہیں سب، جینا کیوں ہے اک بیگار؟
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

دُور کہیں وہ کوئل کوکی، رات کے سناٹے میں دُور
کچّی زمیں پر بکھرا ہو گا، مہکا مہکا آم کا بُور
بارِ مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چُور
کمسن لڑکے گاتے ہوں گے لو دیکھو وہ صبح کا نُور
چاہِ شب سے پھوٹ کے نکلا، میں مغموم کبھی مسرور
سوچ رہا ہوں اِدھر اُدھر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو، ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

نیند سے اب بھی دُور ہیں آنکھیں گو کہ رہیں شب بھر بیخواب
یادوں کے بے معنی دفتر، خوابوں کے افسردہ شہاب

سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں کہ خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش بر آب
مستقبل کی سوچ، اٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی اس آباد خرابے میں!
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

جون ۵۷ء

پسِ دیوارِ چمن

نکہتِ گل نے سحر دم اسے بیدار کیا
اور چپکے سے کہا جا پسِ دیوارِ چمن
عشق پیچاں کی گھنی بیل کے پیچھے تنہا
چاہنے والا ترا، دل میں لئے تیری لگن
منتظر کب سے ہے وہ چونک کے اٹھی جیسے
اپنی آہٹ سے کوئی آہوئے وحشی چونکے
پھر چلی سوئے چمن زلفوں کو شانہ کرتی
اس تغافل سے کہ جیسے پئے گلگشت کوئی
یونہی جاتا ہو کوئی ملنے کا ارمان نہ ہو
اپنے سائے کے سوا اور سے پہچان نہ ہو

بدرقہ بوئے گلِ تر تھی کہیں بادِ نسیم
وہ ہی وہ فرش پہ تھی، عرش پہ تھا ربِّ کریم
لہلہاتا ہوا سبزہ تھا ندی سہج خرام
چال ایسی کہ نہیں جس کا کہیں کوئی بھی نام
عنبر و مشک کا اک قافلہ تھا زلف کا بار
یا کوئی ابرِ رواں دوشِ ہوا پر تھا سوار
پھول بوٹے ہمہ تن گوش تھے کچھ منہ سے کہے
خاک لپٹی چلی جاتی تھی قدم تھامے ہوئے
راہ میں کتنی جگہ شاخوں نے دامن پکڑا
بار ہا شانے سے بے دھیانی میں آنچل ڈھلکا
شاخ سی لچکی، تخئیل سی رکی، اٹھلائی
ہر قدم پر نئے انداز سے ٹھوکر کھائی!

میں وہاں گوش بر آواز جو بیٹھا تھا اٹھا
اور اسے لینے کو آغوش میں جیسے ہی بڑھا
پاؤں الجھا، گرا، یوں آنکھ کھلی پچھلے پہر
اور دیکھا کہ ابھی باقی ہے کچھ شب کا سفر

یونہی بیٹھا رہا، دیکھا کِیا ہوتے تحلیل
پل کو گھڑیوں میں، دنوں سالوں میں لمحاتِ جمیل
زخم بنتے گئے، ناسور بنے، اشک بنے
جیسے ہم گردشِ پرکار تھے ویسے ہی رہے
ناچتا رہتا ہے آگے سحر و شام یونہیں
لوحِ تدبیر پہ لکھا ہوا اک حرف "نہیں!"

جون ۵۷

یہ دور

میں اسی طور سے گرداں ہوں زمانے میں وہی
صبح ہے شام ہے، گہنائی ہوئی راتیں ہیں
کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں دہرائی ہوئی باتیں ہیں
چہرے اترے ہوئے دن رات کی محنت کے سبب
سب وہی قضیے، شکایات، مدارائیں ہیں
سب وہی بغض و حسد، رشک و رقابت، شکوے
دام تزویر ہے، الجھاؤ کی سو گھاتیں ہیں!
سب گلی کوچے وہی، لوگ وہی، موڑ وہی
یہ وہی سردی ہے یہ گرمی، یہ برساتیں ہیں

زلف کی بات ہے یا زہر کہ سب ڈرتے ہیں
کوئی دلدار نہ دلبر نہ ملاقاتیں ہیں
کوئی بشاش ہنسی، جینے کی نوخیز امنگ
کچھ نہیں بس غم واندوہ کی بارائیں ہیں
تنگ دامانی کا شکوہ ہے خدا سے ہر وقت
ہر مرض کے لئے نسخے ہیں مناجاتیں ہیں
جی الٹ جاتا ہے اس حبسِ مسلسل سے مرا
ذہن جاتا ہے کسی نازشِ خوبی کی طرف
یعنی وہ پرتوِ گل خانہ براندازِ چمن
ایک بے پروائی کا جھونکا سا گھنی بدلی سی
شاہدِ نکہت و انوارِ سحر، راحتِ من
رسمِ دلداری ہے اس سیم بدن کے دم سے
اور مرے دم سے ہے عشاق کا بے داغ چلن

کس کے قدموں کی ہے یہ چاپ، یقیناً ہے وہی
یہ یقیناً ہے وہی سروِ چمن بنتِ بہار

کوئی رُت آئے زمانہ نہیں بدلے گا اسے
جانِ من تم ہو؟ نہیں! وہ لبِ عارض وہ نکھار؟
نغمگی جسم کی، وہ لوچ سا، نشہ سا مدام!
ایک چلتا ہوا جادو سا نگاہوں کا قرار!
سچ کہو تم ہی ہو؟ آتا نہیں آنکھوں کو یقیں؟

جون ۵۷ء

مولانا آزاد

میرا نام

مفتیٔ شہر کا ہے یہ فتویٰ
بعد تسبیح و حمدِ ربِ انام
خالقِ شش جہت نے روزِ ازل
یوں مرتب کیا جہاں کا نظام
ایک ذرّہ بھی گر جگہ سے ہلے
گیتی بن جائے حرفِ استفہام
کوہ کو کوہ کی جگہ رکھا
بحر کو بحر کی جگہ، ہر کام
گردشِ مہر و مہ طلوع و غروب
اک سلیقے سے یوں دیا انجام

آج تک عقل و فہم حیراں ہے
ویسے ہی علم اور زباں کی زمام
ہاتھ میں صرف و نحو کے ہے فقط
لیکن اک شخص خود سری کا غلام
خود کو لکھتا ہے اختر الایمان
کور ذوق ابنِ جہل کودن خام
مسخ کرتا ہے قاعدوں کی شکل
تا بگاڑے نہ یہ زبان کا قوام
ہم نے صرف اس کی سرزنش کیلئے
آج جاری کیا ہے اپنا پیام
نام اس کا ہے اک سرے سے غلط
پیشہ اس کا زروئے شرع حرام
اس کے اس نام سے ہیں شرمندہ
اہلِ علم و زبان و فن کے امام
اس نے ڈالا زبان میں رخنہ
کشتنی بے شبہ ہے یہ حلّام
شاعری گو ہے ایک فعل قبیح
اس میں کیا شہرت و بقائے دوام

لیکن اک مدّتِ مدید سے کچھ
صاحبِ کشف و صوفیائے کرام
چونکہ مانوس شاعری سے رہے
سرمد و رومی ایسے غم آشام
زشتت سے خوب کر گئے اس کو
اس لئے سب سنیں خواص و عوام
آج کے بعد ہر جگہ سے ہم
یوں قلم زد کریں گے اس کا نام
تذکرے، علم و فن کی تاریخیں
ذکر سے اس کے ہوں گی خالی تمام
سہو سے کبریا بچائے ہمیں
بر حبیبِ خدا درود و سلام!

اے نگیں خاتمِ زمانہ کے
اے خداوندِ عصر والاتبار
لیجئے خم کر دیا سرِ تسلیم
آپ سے اور میں کروں تکرار؟

مجھ کو خو ہے کہ ہیں وراثت کی
وہ وراثت کیا ہے جس نے فگار
لاش اٹھائے پھروں جہاں جاؤں
میرے شانوں پہ آج تک ہے بار
اس وراثت کا جس میں ابن الوقت
سودا کرتے رہے سرِ بازار
ملک و ملت کا اور محبِ وطن
زہر دے کر کئے گئے بیمار
میرے شانوں پہ آج تک ہے بار
اس وراثت کا قوم کی تاریخ
بن گئی جس میں جھوٹ کا طومار
نام پاسنگ بھی نہیں ان کا
اے خداوندِ عصر والاتبار
دین ہے یہ بھی کچھ بزرگوں کی
میں سہی ابنِ جہل ہذیاں کار
لیکن اے مبلغ واساسِ علم
گزرے جاتے ہیں یونہی لیل و نہار

میرے اس نام پر تو چونکے حضور
پر توجہ نہ دی کبھی زنہار
ہیں بہت ایسے لوگ بھی جن کے
نام تو ٹھیک ہیں مگر اطوار؟
بیچتا ہے مدک، چرس، کوکین
روز ملتا ہے راہ میں غفّار
ایک بار رالدجے ہیں برسوں سے
ایسے ہوتے ہیں شب کو جلوہ یار
شاہد و مے کی ان سے فرمائش
کیجیے، چٹکی بجی کہ سب تیار
کیسا موزوں ہوا ہے ان پر نام
بخشیے ان کو خلعت و دستار
بارِ خاطر نہ ہو تو یہ بھی کہوں
آپ کے دورِ ساتگیں میں خمار
چھوڑ کر میکدے صراحی جام
گندی گلیوں میں آیا پہلی بار
علمِ اخلاق پر بہت ہے زور
تھانے میں کنٹروں کا ہے انبار

یوں برائی مٹائی جاتی ہے
جڑ نہیں، کاٹتے برگ و بار!
طبعِ نازک پہ نام تو ہے گراں
ہاں مگر زندگی کی یہ رفتار
یہ زبوں حالی آدمیت کی
سائنس جیسے ہے اک اپنی تلوار
صبح سے شام تک شکم ہی شکم
آدمی ہے مشین یا ہتھیار
بوزنہ، گوسفند، یا جیسے
اور حشرات الارض، جن کا شمار
کرنے بیٹھیں تو صرف ہوں دفتر
ایسے ہی آدمی بھی ہے سرکار
آدمی آدمی کہاں ہے ابھی!
آدمی ہے ابھی قفسِ جاں دار
مدرسے، اصطبل، ادب گاہیں
ایک پیمانے کا ہے کاروبار
اے خداوندِ صرف و نحو، ابھی
یہ زمیں ہے لطافتوں کا مزار
توسنِ زیست ہے خرِ پالنگ
آنکھیں موندیں ہیں آپ جس پہ سوار!

جون ۱۹۵۸ء

نیا شہر

جب نئے شہر میں جاتا ہوں وہاں کے در و بام
لوگ وارفتہ، سراسیمہ، دکانیں، بازار
بُت نئے راہنماؤں کے پُرانے معبد
حزن آلود شفا خانے، مریضوں کی قطار
تار گھر، ریل کے پُل، بجلی کے کھمبے، تھیٹر
راہ میں دونوں طرف نیم برہنہ اشجار
اشتہار ایسی دواؤں کے ہر اک جا چسپاں
اچھے ہو جاتے ہیں ہر طرح کے جن سے بیمار
اس نئے شہر کی ہر چیز لبھاتی ہے مجھے
یہ نیا شہر نظر آتا ہے، خوابوں کا دیار

شاید اس واسطے ایسا ہے کہ اس بستی میں
کوئی ایسا نہیں جس پر ہو مری زیست کا بار
کوئی ایسا نہیں، جو جانتا ہو میرے عیوب
آشنا، ساتھی، کوئی دشمنِ جاں، دوست شعار!

۲۶ر فروری ۱۹۵۹ء

دُعاء

اب نہ شوریدہ سری ہے نہ امنگوں کا ہجوم
لب پہ فریاد نہ بکھراتے ہیں پلکوں پہ نجوم
اب نہیں اٹھتا مرے سینے میں آہوں کا دھواں
اب نہیں پڑتا سرِ راہ کوئی ایسا مکاں
جس کی دیوار کے سائے میں سحر گاتی ہو
گوشہ گوشہ سے جہاں بُوئے چمن آتی ہو
اب نہیں نظریں بھٹکتیں کسی صورت کے لئے
اب نہیں رُکتے کسی در پہ عبادت کے لئے
کوئی بیٹھا ہے پسِ پردہ نہیں ہوتا قیاس
میں بگولہ ہوں مجھے اب نہیں ہوتا احساس

میرے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل کا مفہوم
گردشِ خون ہے باقی ہے ہر اک شے معدوم
میری وہ آنکھیں تڑپتا تھا کبھی جن میں شباب
جو رہا کرتی تھیں اک درد کے مارے بیخواب
آج اس واسطے چہرے پہ ہیں بینا کہلاؤں
آج اس واسطے بینا ہوں کہ سب دیکھتا جاؤں
تم نے میرے لئے جس دن کی دعا مانگی تھی
یہ وہی روزِ قیامت ہے مبارک ہو تمہیں!

۱۸ر نومبر ۵۹ء

عمرِ گریزاں کے نام

عمر یوں مجھ سے گریزاں ہے کہ ہر گام پہ میں
اس کے دامن سے لپٹتا ہوں مناتا ہوں اسے
واسطہ دیتا ہوں محرومی و ناکامی کا
داستاں آبلہ پائی کی سناتا ہوں اسے
خواب ادھورے ہیں جو دہراتا ہوں ان خوابوں کو
زخم پنہاں ہیں جو وہ زخم دکھاتا ہوں اسے
اس سے کہتا ہوں تمنا کے لب و لہجے میں
اے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کے حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں

اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گذاری کے لئے میں بھی پلٹ آتا ہوں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ملتوی کرتا رہا کل پہ تری دید کو میں
اور کرتا رہا اپنے لئے ہموار زمیں
آج لیتا ہوں جوان سوختہ راتوں کا حساب
جن کو چھوڑ آیا ہوں ماضی کے دھندلکے میں کہیں
صرف نقصان نظر آتا ہے اس سودے میں
قطرہ قطرہ جو کریں جمع تو دریا بن جائے
ذرّہ ذرّہ جو بہم کرتا تو صحرا ہوتا
اپنی نادانی سے انجام سے غافل ہو کر
میں نے سالوں کو کیا جمع خسارہ بیٹھا
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
اے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں!

۱۰ جنوری سنہ ۶۱ء

میر ناصر حسین

چرخِ نیلی فام ازل سے ہے جفا جو کینہ ساز
اس کی آنکھوں میں نہیں اچھے بُرے کا کچھ لحاظ
ہم سے اُن کو چھین لیتا ہے جو ہیں بے حد مفید
جن کو کہنا چاہیئے ہر قفلِ بستہ کی کلید
میر ناصر جن کی کل برسی تھی، ایسے شخص تھے
یہ جہانِ سفلہ پرور نیست ہو، چاہے، رہے
کتبۂ ایّام پر کندہ رہے گا اُن کا نام
اور ہم کرتے رہیں گے اُن کا یُوں ہی احترام
ایک رات ان ہی دنوں کی بات ہی میں پارسال
گھر میں چھپ کر پڑھ رہا تھا مثنوی خواب و خیال

جانے کس کو یہ سنا کہتے ہوئے دیکھو تو بھئے
آج اس دار المحن سے میر ناصر اُٹھ گئے
موت نے پھینکی عروسِ زندگانی پر کمند
بیٹھے بیٹھے دل کی حرکت ہو گئی یک لخت بند
سُن کے گھونسہ سا لگا دل نے کہا اے آسماں
اب کہاں سے لائے گا تو ایسی نادر ہستیاں
مجھ کو کیا، اس موت کا ہر شخص کو صدمہ ہوا
سب رسائل اور اخبارات نے ماتم کیا
کچھ نے اُن کو رہنما و ہادی و رہبر لکھا
کچھ نے لکھا قوم کی کشتی کے تھے وہ ناخدا
کچھ نے غم کا یوں کیا اظہار اب دل ہے دو نیم
وہ گئے کیا ہو گئی ہے ملّتِ بیضا یتیم
شہر میں جلسے ہوئے سب نے لیا یہ اعتراف
میر صاحب جو بھی تھے پر آدمی تھے دل کے صاف
ان کے مرنے سے غرض ہر سو صفِ ماتم بچھی
مدّتوں محسوس کی جاتی رہی اُن کی کمی
دُھوم سے سوئم ہوا، دسواں ہوا، چہلم ہوا
مختصر یہ ہے شرارہ تیرگی میں گم ہوا

اے خدا پسماندگاں کو کر عطا صبرِ جمیل
ضبط کی توفیق دے ان کو جو ہیں غم سے قتیل

میرناصر کو مرے گو ہو گیا کل ایک سال
ذہن میں باقی ہیں ابتک ان کے سارے خط و خال
لانبا قد، کچھ پھیلی پھیلی ناک تھی، چہرہ طباق
دہری کاٹھی، چال میں تھا اک عجب سا طمطراق
آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن سے جھانکتے تھے رُسدِ و خیر
بات کرتے تھے تو یوں لگتا تھا ہیں گرمِ ستیز
بلبلاتے تھے، ہنسی کیا تھی، مگر اک حسن تھا
ان کی ہر اک بات میں، دلکش تھی اُن کی ہر ادا
میں بھی اُن کی بارگاہِ خوب میں تھا باریاب
اور اکثر ان کی باتوں سے ہوا ہوں فیضیاب
کہتے تھے میں آج کے اخلاق کی تصویر ہوں
آدمی کا خواب ہے یہ عہد، میں تعبیر ہوں
آج کی دنیا میں مجھ سا آدمی ہے کامیاب
صرف مجھ ایسوں کی ہوتی ہیں دعائیں مستجاب

آدمی معمولی خوانده تھے مگر بے حد ذہین
شور یا زر خیز ہے پہچانتے تھے ہر زمین
حلقۂ احباب میں شامل تھے ان کے بیشتر
مقتدر حکّام، ذی منصب سیاسی چارہ گر
شخصیت کوئی ہوا اس کا ہو نہ ہو کچھ رابطہ
میر صاحب سے براہِ راست یا بالواسطہ
اس طرح ہوتا تھا جیسے دونوں ہوں شیر و شکر
سب پہ رکھتے تھے بڑی گہری محبت کی نظر
دعوتوں کا سلسلہ رہتا تھا گھر پر صبح و شام
اس قدر مخلص تھے خود کرتے تھے سارا اہتمام
قدر دانی میں نہ کی بھولے سے بھی کوئی کمی!
دوستوں کے واسطے حاضر تھی اُن کی جان بھی
مذہب و ملت کی اُن کے ہاں نہیں تھی کوئی قید
ہم نشینوں میں سبھی شامل تھے رام آہل جان زید
شعر بھی کہتے تھے لیکن صرف اپنے واسطے
سُنیے ایک اک لفظ میں کیا کیا معانی ہیں چھپے

"آگ سے پکتا ہے کھانا بھاپ سے چلتی ہے ریل
بے وسیلے رچ نہیں سکتا کوئی دنیا کا کھیل
پیٹ سے بڑھ کر نہیں کوئی خدا، ایمان، دین،
آدمی کے پاس گر پیسہ نہیں، کوڑی کے تین"
مختصر یہ ہے بہت سی خوبیوں کے شخص تھے
صُلح کُل مشرب رہا مرحوم کا جب تک جیئے
اُن کی اس نیّت کا پھل یہ ہے کہ اُن کے نورِ چشم
زندگی بھر جو رہے اُن کے لئے اک وجہِ خشم
جن کی خاطر وہ بنے اکثر ملامت کا ہدف
جن کو دنیا یہ سمجھتی تھی کہ ہیں سب ناخلف
آج فضلِ ایزدی سے صاحبِ املاک ہیں
اچھے رتبوں پر ہیں فائز گو سراپا خاک ہیں
باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں وہ بھی آج
وہ بھی اب پہچانتے ہیں اس زمانے کا مزاج

قاعدہ ہے آدمی کا رتبہ بڑھ جاتا ہے جب
تذکرہ ہوتا ہے اس کا ہر طرح کا روز و شب

بعض لوگوں کو دکھائی دیتا ہے مشرق جنوب
ڈھونڈتے ہیں مرنے والے میں اگر کچھ تو عیوب
آج کل احباب کے حلقے میں ہے افواہ گرم!
اس اچانک موت کا چرچا تھا اک دنیا کی شرم!
اصلیت یہ ہے انہوں نے خودکشی کی تھی، مگر
اُن کے لڑکوں نے اڑا دی دل کے دورے کی خبر!
خودکشی کی وجہ کچھ اوقاف ہیں جن کی رقوم
میر صاحب کے تصرّف میں رہی تھی بالعموم
ایسے ہی کچھ بے سروپا اور بھی الزام ہیں
لیکن ایسی ساری خبریں مفسدوں کے کام ہیں
خلوت و جلوت میں دیکھا میں نے ان کو بارہا!
مدّتوں اُن کی رفاقت کا شرف حاصل رہا!
زندگی تھی اُن کی سب کے سامنے اک وا کتاب
لمحے لمحے کا کوئی مانگے تو مل جائے حساب
رہ گئی یہ بات وہ بالکل فرشتہ تھے نہیں
عام لوگوں میں جو ہیں کمزوریاں اُن میں بھی تھیں

خود کہا کرتے تھے مکروہات کا پُتلا ہوں میں
سب ہیں جیسے ویسا ہی اللہ کا اک بندہ ہوں میں
اب کہاں پیدا ہیں ایسی ہشت پہلو ہستیاں
اہلِ حرص و آز سے معمور ہیں گھر بستیاں !
آیئے پھیلائیں ان کے واسطے دستِ دعا
گڑگڑا کر یوں کہیں ، اے مالکِ یومِ جزا
عاجز و کمتر ہیں بندے تو ہے دانا اور علیم
جز ترے پہچانتا ہے کون راہِ مستقیم
بہر ناچہر سے اگر کوئی خطا سرزد ہوئی
ایک ہی اس کا سبب ہے دور بینی کی کمی
آدمی پُتلا خطاؤں کا ہے تو ہے نکتہ ور
ان کو بحرِ عفو کی گہرائیوں میں غرق کر
کشتۂ ایّام پہ کندہ ہو ان کا نیک نام
اور ہم کرتے رہیں اُن کا ہمیشہ احترام
آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء

مامن

بہار بھی آ کے جا چکی تھی خزاں بھی گلشن سے جا رہی ہے
مگر وہ اک برگِ نادمیدہ جو شاخ کے بطن میں ابھی ہے
وہ ایک پتّی جو کل اُگے گی، وہ ایک غنچہ جو کل کھلے گا
اسے خبر کیا کہ ایک چھوٹی سی ایک نازک سی شاخِ گُل نے
نہ جانے کتنی صعوبتوں سے، ہزار طوفان سے گزر کے
کیا ہے تخلیق اس سمن بر کو ، اور یہ سازگار دُنیا
جہاں تمہارے شگفتہ ہونٹوں میں کھلتے پھولوں کی تازگی ہے
جہاں تمہارے حسین قامت میں نرم شاخوں کا لوچ سا ہے
اسے بھی ہموار کرتے کرتے لہو ہوا کتنے گُل رُخوں کا!
یہاں کی ہر مشتِ خاک پھولوں کا عطر ہے، روحِ برگِ گُل ہے
یہ مامنِ عشقِ رفتگاں ہے زمیں کو نفرت سے یوں نہ روندو!

کتبہ

دل ہے کہ اُجاڑ کوئی بستی
ہر سمت مزار جا بجا ہیں
ہیں مرثیہ خواں نہیں کسی کا
لیکن وہ مزارِ لوح جس کی
شفّاف ہے آئنہ کی مانند
کس کا ہے چلو نہ آؤ دیکھیں
ہے ہے کوئی طفلِ آرزو ہے
کمسن ہے کلی ہے نو دمیدہ!

۱۹ مئی ۱۹۶۱ء